محمد لائبریری

پانی کا درخت

افسانے

کرشن چندر

نیا ادارہ

12/00

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پانی کا درخت

کرشن چندر

* زندگی کے موڑ پر (طویل مختصر افسانے)
* ان داتا (افسانے)
* تین غنڈے (افسانے)
* ٹوٹے ہوئے تارے (افسانے)
* طلسم خیال (افسانے)
* غدار (ناول)
* ربڑ کی عورت (افسانے)

افسانے

کرشن چندر

پانی کا درخت

نیا ادارہ

۱۵۔ سرکلر روڈ لاہور

جملہ حقوق محفوظ

دوم بار: ۱۹۸۱ء

طابع و ناشر مشتاق احمد چودھری
نیا ادارہ
سویرا آرٹ پریس - لاہور

کچھ قفس کی تیلیوں سے چھن رہا ہے نور سا
کچھ فضا کچھ حسرتِ پرواز کی باتیں کریں۔

افسانے

پانی کا درخت، ۹
سال گرہ، ۳۴
چاول چور، ۴۴
امریکہ سے آنے والا ہندوستانی، ۶۸
محبت کا پھول، ۸۱
سو روپے، ۹۵
برہم پترا، ۱۱۲
موم کی چٹان، ۱۵۷
نیا خزانہ، ۱۸۳

پانی کا درخت

جہاں ہمارا گاؤں ہے اس کے دونوں طرف پہاڑوں کے روکھے سوکھے سنگلاخی سلسلے ہیں۔ مشرقی پہاڑوں کا سلسلہ بالکل بے ریش و بروت ہے۔ اس کے اندر نمک کی کانیں ہیں۔ مغربی پہاڑی سلسلے کے چہرے پر جنڈ، بھیکڑ، املتاس اور کیکر کے درخت اُگے ہوئے ہیں۔ اس کی چٹانیں سیاہ ہیں لیکن ان سیاہ چٹانوں کے اندر میٹھے پانی کے دو بڑے قیمتی چشمے ہیں، اور ان دو پہاڑی سلسلوں کے بیچ میں ایک چھوٹی سی تلہٹی پر ہمارا گاؤں آباد ہے۔

ہمارے گاؤں میں پانی بہت کم ہے۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے میں نے اپنے گاؤں کے آسمان کو تپتے ہوئے پایا ہے۔ یہاں کی زمین کو ہانپتے ہوئے دیکھا ہے اور گاؤں والوں کے محنت کرنے والے ہاتھوں اور چہروں پر ایک ایسی ترسی ہوئی بھوری چمک دیکھی ہے جو صدیوں کی ناآسودہ پیاس سے پیدا ہوتی ہے۔

ہمارے گاؤں کے مکان اور آس پاس کی زمین بالکل بھوری اور خشک نظر آتی ہے۔ زمین میں باجرے کی فصل جو ہوتی ہے۔ اس کا رنگ

بھی بھورا بلکہ سیاہی مائل ہوتا ہے۔ یہی حال ہمارے گاؤں کے کسانوں اور ان کے کپڑوں کا ہے۔ صرف ہمارے گاؤں کی عورتوں کا رنگ سنہری ہے کیونکہ وہ چشمے سے پانی لاتی ہیں۔

بچپن ہی سے میری یادیں پانی کی یادیں ہیں، پانی کا درد اور اس کا تبسم، اس کا ملنا اور کھو جانا۔ یہ سینہ اس کے فراق کی تمہید اور اس کے وصال کی تاخیر سے گودا ہوا ہے۔

مجھے یاد ہے جب میں بہت چھوٹا سا تھا تو دادی اماں کے ساتھ گاؤں کی تلہٹی کے نیچے بہتی ہوئی رویل ندی کے کنارے کپڑے دھونے کے لئے جایا کرتا تھا۔ دادی اماں کپڑے دھوتی تھیں میں انہیں سکھانے کے لئے ندی کے کنارے چمکتی ہوئی بھوری ریت پر ڈال دیا کرتا۔ اس ندی میں پانی بہت کم تھا۔ یہ بڑی دبلی پتلی ندی تھی۔ چھوہری اور آہستہ خرام جیسے ہمارے سردار پیندا خاں کی لڑکی بانو مجھے اس ندی کے ساتھ کھیلنے میں اتنا ہی لطف آتا تھا جتنا بانو کے ساتھ کھیلنے میں دونوں کی مسکراہٹ میٹھی تھی، اور مٹھاس کی قدر وہی لوگ جانتے ہیں جو میری طرح نمک کی کان میں کام کرتے ہیں۔

مجھے یاد ہے ہماری رویل ندی سال میں صرف چھ مہینے بہتی تھی، چھ مہینے کے لئے سوکھ جاتی۔ جب چیت کا مہینہ جانے لگتا تو ندی سوکھنا شروع ہوتی اور جب بیساکھ ختم ہونے لگتا تو بالکل سوکھ جاتی، اور پھر اس کی تہہ پر کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے نیلے پتھر رہ جاتے یا نرم نرم

کیچڑ جس میں چلنے سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ریشم کے دبیز غالیچے پر گھوم رہے ہوں۔

چند دنوں میں ہی ندی کا کیچڑ بھی سوکھ جاتا اور اس کے چہرے پر باریک درزوں اور جھریوں کا جال پھیل جاتا کسی محنتی کسان کے چہرے کی طرح اس کے ہونٹوں پر خشک پپڑیاں جم جاتیں اور ایسا معلوم ہوتا جیسے اس کی گرم گداز ریت نے سالہا سال سے پانی کی ایک بوند نہیں چکھی۔

مجھے یاد ہے پہلی بار جب میں نے ندی کو اس طرح سوکھتے ہوئے پایا تھا تو بالکل بے چین اور پریشان ہو گیا تھا، اور اس رات سو بھی نہ سکا تھا۔ اس رات دادی اماں مجھے بہت دیر تک گود میں لے کر عجیب عجیب کہانیاں سناتی رہیں اور ساری رات دادی اماں کی گود میں لیٹے لیٹے مجھے رویل ندی کی بہت سی پیاری پیاری باتیں یاد آنے لگیں۔ اس کا ہولے ہولے پتھروں سے ٹھمکتے ہوئے چلنا، اور پتھروں کے درمیان سے اس کا ذرا تیز ہونا اور کترا کر چلنا، جیسے کبھی کبھی بانو غصے میں گلی کے موڑ پر سے تیزی سے نکل جاتی ہے اور جہاں دو پتھر ایک دوسرے کے بہت قریب ہوتے تھے وہاں میں اور بانو باجرے کی ڈنڈیوں کی بنی ہوئی پن چکی لٹکا دیتے تھے اور گیلا آٹا پساتے تھے۔ پن چکی ندی کی آہستہ خرامی کے باوجود کیسے کیسے تیز تیز چکر لگا کر گھومتی تھی۔ اور اب یہ ندی سوکھ گئی۔

ان سب باتوں کو یاد کر کے مَیں نے دادی اماں سے پوچھا۔
"دادی اماں یہ ہماری ندی کہاں چلی گئی؟"
"زمین کے اندر چھپ گئی"
"کیوں؟"
"سورج کے ڈر سے۔"
"کیوں؟ یہ سورج سے کیوں ڈرتی ہے؟ سورج تو بہت اچھا ہوتا ہے۔"
"سورج ایک نہیں ہے بیٹا، دو سورج ہیں۔ ایک تو سردیوں کا سورج ہے، وہ بڑا اچھا اور مہربان ہوتا ہے۔ دوسرا سورج گرمیوں کا ہے۔ یہ بڑا تیز، چمکیلا اور غصے والا ہوتا ہے، اور یہ دونوں باری باری ہر سال ہمارے گاؤں میں آتے ہیں۔ جب تک تو سردیوں کا سورج رہتا ہے ہماری ندی اس سے بہت خوش رہتی ہے، لیکن جب گرمیوں کا ظالم سورج آتا ہے تو ہماری ندی کے جسم سے اس کا لباس اُتارنا شروع کرتا ہے۔ ہر روز کپڑے کی ایک تہہ اُترتی چلی جاتی ہے اور جب بیساکھ کا آخری دن آتا ہے تو ندی کے جسم پر پانی کی ایک پتلی سی چادر رہ جاتی ہے۔ اس رات کو ہماری ندی شرم کے مارے زمین میں چھپ جاتی ہے اور انتظار کرتی ہے سردیوں کے سورج کا جو اس کے لئے اگلے سال پانی کی نئی پوشاک لائے گا۔"
مَیں نے آنکھ جھپکتے ہوئے کہا۔ "سچ مچ گرمیوں کا سورج تو بہت

بُرا ہے۔

"لو اب سو جاؤ بیٹا۔"

مگر مجھے نیند نہیں آ رہی تھی اس لیے میں نے ایک اور سوال پوچھا

"دادی اماں یہ ہمارے نمک کے پہاڑ کا پانی کیوں کڑوا ہے؟"

ہمارے گاؤں میں بچے پانی کے لئے بہت سوال کرتے ہیں۔ پانی ان کے تخیل کو ہمیشہ اُکساتا رہتا ہے۔ دوسرے گاؤں میں، جہاں پانی بہت ہوتا ہے، وہاں کے لڑکے شاید سونے کے جزیرے ڈھونڈتے ہوں گے یا پرستان کا رستہ تلاش کرتے ہوں گے لیکن ہمارے گاؤں کے بچے ہوش سنبھالتے ہی پانی کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں اور تلہٹی پر اور پہاڑی پر دور دور تک پانی کو ڈھونڈنے کا کھیل کھیلتے ہیں۔ میں نے بھی اپنے بچپن میں پانی کو ڈھونڈا تھا اور نمک کے پہاڑ پر پانی کے دو تین نئے چشمے دریافت کیے تھے۔ مجھے آج تک یاد ہے۔ میں نے کتنے چاؤ اور خوشی سے پانی کا پہلا چشمہ ڈھونڈا تھا، کس طرح کانپتے ہوئے ہاتھوں سے میں نے چٹانوں کے درمیان سے جھجکتے ہوئے پانی کو اپنی چھوٹی چھوٹی انگلیوں کا سہارا دے کر باہر بلایا تھا اور جب میں نے پہلی بار اسے اپنی اوک میں لیا تو پانی میرے ہاتھ میں یوں کانپ رہا تھا جیسے نوزائیدہ بچے کے ہاتھوں میں کانپتی ہے۔

پھر جب میں اسے اوک میں بھر کر اپنی زبان تک لے گیا، تو مجھے یاد ہے میری کانپتی ہوئی خوشی کیسے تلخ اُچھو میں تبدیل ہو گئی تھی پانی نے زبان پر جاتے ہی بچھو کی طرح ڈنک مارا، اور اس کے زہر

نے میری روح تک کو کڑوا کر دیا۔ میں نے پانی تھوک دیا اور پھر کسی نئے چشمے کی تلاش میں چل کھڑا ہوا، لیکن نمک کے پہاڑ پر مجھے آج تک میٹھا چشمہ نہ ملا۔ اس لئے جب ندی سوکھنے لگی تو میٹھے چشمے کی یاد نے مجھے بے چین کر دیا اور میں نے دادی اماں سے پوچھا۔ "دادی اماں یہ نمک کے پہاڑ کا پانی کڑوا کیوں ہے؟"

دادی اماں نے کہا۔ "یہ تو ایک دوسری کہانی ہے؟"

"تو سناؤ"

"نہیں اب سو جاؤ۔"

"نہیں سناؤ، نہیں تو ہم روئیں گے۔"

"اچھا بابا سناتی ہوں، مگر تم اب چیخو گے نہیں۔"

"نہیں۔"

"اور نہ ہی بیچ بیچ میں ٹوکو گے۔"

"نہیں۔"

"اچھا تو سنو۔ یہ تم اس طرف نمک کی پہاڑی جو دیکھتے ہو یہ پرانے زمانے میں ایک عورت تھی جو اس پہاڑ کی بیوی ہے، جہاں آج کل میٹھے پانی کے چشمے ہیں۔"

"پھر؟"

"پھر ایک روز دیووں میں بڑی جنگ چھڑی اور یہ سامنے کا پہاڑ بھی، جو اس عورت کا خاوند تھا، جنگ میں بھرتی ہو گیا اور بیوی کو

پیچھے چھوڑ گیا اور اسے کہہ گیا کہ وہ اس کے آنے تک کہیں نہ جائے، نہ کسی سے بات کرے، صرف اپنے گھر کا خیال کرے۔"

"اچھا۔"

"ہاں۔ پھر کئی سال تک بیوی اپنے دیو خاوند کا انتظار کرتی رہی لیکن اس کا خاوند جنگ سے نہ لوٹا۔ آخر ایک دن اس کے گھر میں ایک سفید دیو آیا اور اس پر عاشق ہو گیا۔"

"عاشق کسے کہتے ہیں؟"

دادی اماں رُک گئیں، بولیں۔ "تو نے پھر ٹوکا۔"

میں نے دل میں سوچا۔ دادی اماں اگر خفا ہو گئیں تو باقی کہانی سُننے کو نہیں ملے گی، اور کہانی اب دلچسپ ہوتی جا رہی ہے۔ اس لیے چپکے سے سُن لینا چاہیے، عاشق کا مطلب بعد میں پوچھ لیں گے۔ اس لیے میں نے جلدی سے سوچ کر دادی اماں سے کہا۔ "اچھا اچھا، دادی اماں آگے سُناؤ، اب نہیں ٹوکیں گے۔"

دادی اماں بڑی رکھائی سے اس طرح خفا ہو کے بولیں جیسے انہیں کہانی کا آگے آنے والا حصّہ پسند نہیں ہے۔

کہنے لگیں۔ "ہونا کیا تھا، مغربی پہاڑ کی بیوی بے وفا نکلی۔ جب اسے سفید دیو نے جھوٹ موٹ یقین دلا دیا کہ اس کا پہلا خاوند دیوؤں کی جنگ میں مارا گیا ہے تو اس نے سفید دیو سے شادی کر لی۔"

"دیوؤں کی جنگ کیوں ہوئی تھی؟" میرے منہ سے بے اختیار

نکل گیا۔

"تو نے پھر ٹوکا۔" دادی اماں بہت خفا ہو کے بولیں،

"چل اب آگے نہیں سناؤں گی۔"

"نہیں دادی اماں، میری اچھی دادی اماں۔ اچھا اب، اب بالکل نہیں ٹوکوں گا۔" میں نے منت سماجت کرتے ہوئے کہا۔

"پھر؟"

"پھر ایک دن بہت سالوں کے بعد ایک بوڑھا دیو اس وادی میں آیا۔ یہ اسی عورت کا پہلا خاوند تھا۔ جب اس نے اپنی بیوی کو سفید دیو کے ساتھ دیکھا تو اسے بہت غصہ آیا اور اس نے کلہاڑا لے کر سفید دیو اور اپنی بیوی کو قتل کر دیا۔ جب سے ان دونوں پہاڑوں کو بڑے پیر کی بد دعا لگی ہے اور یہ لوگ سل پتھر ہو گئے ہیں۔ سامنے والے پہاڑ کا پانی اس لیے میٹھا ہے کیونکہ اسے اپنی بیوی سے سچی محبت تھی۔ اس کے مقابل پہاڑ کا پانی کھارا ہے اور اس میں نمک ہے کیونکہ وہ عورت ہے اور اپنی بے وفائی پہ ہر وقت روتی رہتی ہے اور جب اس کے آنسو خشک ہو جاتے ہیں تو نمک کے ڈلے بن جاتے ہیں، جنہیں ہر روز تمہارا باپ پہاڑ کے اندر جا کے کھود کے نکالتا ہے۔"

"پھر؟"

"پھر کہانی ختم۔"

کہانی ختم ہو گئی اور میں بھول گیا کہ میں نے کیا سوال کیا تھا، مجھے

کیا جواب ملا۔ میں نے کہانی سن لی، اطمینان کا سانس لیا اور پلک جھپکتے ہی سو گیا۔ سوتے سوتے میری آنکھوں کے سامنے نمک کی کان کا منظر آیا جہاں میرے ابا کام کرتے تھے، جہاں جوان ہو کر مجھے کام کرنا پڑا اور جہاں پہلی بار میں اپنی اماں کے ساتھ اپنے ابا کا کھانا لے کے گیا تھا۔ افوہ! کتنی بڑی کان تھی وہ۔ چاروں طرف نمک کے پہاڑ، نمک کے ستون نمک کے آئینے نمک کی دیواروں میں لگے ہوئے تھے۔ ایک جگہ نمک کی بڑی جھیل تھی جس کے چاروں طرف نیلگوں دیواریں تھیں اور چھت بھی نمک کی تھی۔ جس سے قطرہ قطرہ کر کے نمک کا پانی رستا تھا اور نیچے گر کر جھیل بن گیا تھا اور یکایک مجھے خیال آیا یہ اس عورت کے آنسو ہیں جو بڑے پیر کی بد دعا سے نمک کا پہاڑ بن چکی ہے۔

میرے ابا اس جھیل کو دیکھ کر بولے۔ "یہاں اس قدر پانی ہے پھر بھی پانی کہیں نہیں ملتا۔ دن بھر نمک کی کان میں کام کرتے کرتے سارے جسم پر نمک کی پتلی سی جھلی چڑھ جاتی ہے۔ جسے کھوچو تو نمک چورا چورا ہو کے گرنے لگتا ہے۔ اس وقت کس قدر وحشت ہوتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہیں میٹھے پانی کی جھیل ہو اور آدمی اس میں غوطے لگاتا جائے۔"

پانی! پانی!

پانی سارے گاؤں میں کہیں نہیں تھا۔ پانی نمک کے پہاڑ پر بھی نہیں تھا۔ پانی تھا تو سامنے پہاڑ پر جس کی محبت نے بے وفائی نہیں کی تھی۔ یا پانی پھر رویل ندی میں تھا۔ لیکن یہ ندی بھی چھ مہینے غائب رہتی

تھی۔ اور پھر آخر ایک دن یہ بالکل ہی غائب ہو گئی اور آج تک اس کی تہ کے نیلے پتھر اور سوکھی ریت اور اس کے کنارے کنارے چلنے والی عورتوں کے نا امید قدم اس کی راہ تکتے ہیں۔ لیکن یہ میرے بچپن کی کہانی نہیں ہے، یہ میرے لڑکپن کی کہانی ہے جب ہمارے گاؤں سے بہت دوران پہاڑی سلسلوں کے دوسری طرف سینکڑوں میل لمبی جاگیر کے مالک راجہ اکبر علی خاں نے ہمارے دیہات والوں کی مرضی کے خلاف رویل ندی کا بہاؤ موڑ کر اپنی جاگیر کی طرف کر لیا اور ہماری تلہٹی کو اور آس پاس کے بہت سے علاقے کو سوکھا، بنجر اور ویران کر دیا۔ اس وقت اس ندی کے کنارے کا ہمارا گاؤں اور اس وادی کے اور دوسرے بہت سے گاؤں یوں پریشان ہو گئے۔ جیسے بہت سے بچے یکایک اپنی ماں کے مر جانے پر یتیم ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ہمارے لیے رویل ندی مر گئی اور اس کا پانی بھی مر گیا اور ہمارے لیے ایک تلخ یاد چھوڑ گیا۔

مجھے یاد ہے اس وقت گاؤں والوں نے دوسرے گاؤں والوں سے مل کر سرکار کو ایک عرضی دی تھی، راجہ اکبر علی خاں کے ظلم کے خلاف اور سرکار سے اپنی کھوئی ہوئی ندی مانگی تھی کیونکہ ندی تو گھر کی عورت کی طرح ہے۔ وہ گھر میں پانی دیتی ہے، کھیتوں میں کام کرتی ہے ہمارے کپڑے دھوتی ہے، جسم کو صاف رکھتی ہے۔ ندی کے گیت اس کے بچے ہیں جنھیں وہ لوری دیتے ہوئے، تھپکتے ہوئے مغرب کے جھولے کی طرف لے جاتی ہے۔ پانی کے بغیر ہمارا گاؤں بالکل ایسا تھا جیسے گھر

عورت کے بغیر۔ گاؤں والوں کو بالکل ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے ان کے گھر سے ان کی لڑکی اغوا کر لی ہو۔ وہی غم، وہی غصہ تھا، وہی تیور تھے، وہی مرنے مارنے کے انداز تھے۔

لیکن راجہ اکبر علی خاں چکوال کے علاقے کا سب سے بڑا زمیندار تھا۔ حکومت کے افسروں کے ساتھ اس کا گہرا رسوخ تھا۔ نمک کی کان کا ٹھیکہ بھی اس کے پاس تھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ گاؤں والوں کو ان کی ندی واپس نہ ملی، اُلٹا ہمارے بہت سے گاؤں والے، جو نمک کی کان میں کام کرتے تھے، باہر نکال دیے گئے۔ ان کا قصور صرف یہ تھا کہ انھوں نے اپنے گاؤں کے اغوا شدہ پانی کو واپس بلانے کی جرات کی تھی۔ مجھے یاد ہے اس روز ابا کانپتے کانپتے گھر میں آئے تھے ان کے چہرے کا رنگ اُڑا ہوا تھا اور بار بار اپنے کانوں کو ہاتھ لگا کے کہتے۔ "توبہ توبہ! کیسی غلطی ہوئی۔ وہ تو اللہ کا کرم تھا کہ میں بچ گیا ورنہ راجہ صاحب مجھے بھی نکال دیتے میں تو اب کبھی راجہ جی کے خلاف عرضی نہ دوں، چاہے وہ پانی تو کیا میری لڑکی ہی کیوں نہ اغوا کر کے لے جائیں۔ توبہ توبہ!"

اور یہ بھی سچ ہے کہ ہمارے گاؤں میں پانی کی عزت لڑکی کی طرح بیش قیمت ہے۔ پانی، جو زندگی دیتا ہے۔ پانی، جو رگوں میں خون بن کر دوڑتا ہے۔ پانی، جو منہ دھونے کو نہیں ملتا۔ پانی، جس کے نہ ہونے سے ہمارے کپڑے بھورے اور میلے رہتے ہیں، سر میں جوئیں، جسم

پر پسینے کی دھاریاں اور روح پر نمک جما رہتا ہے۔ یہ پانی تو سونے سے زیادہ قیمتی ہے اور لڑکی سے زیادہ حسین، اس کی قدر اور قیمت ہمارے گاؤں والوں سے پوچھیے جن کی زندگی پانی کے لئے لڑتے جھگڑتے گزرتی ہے۔ ایک دفعہ سامنے کے پہاڑ کے میٹھے چشمے سے پانی لانے کے لیے سرور خاں کی بیوی سیداں اور ایوب خاں کی بیوی عائشاں دونوں آپس میں لڑ پڑی تھیں حالانکہ دونوں اتنی گہری سہیلیاں تھیں کہ ہر وقت اکٹھی رہتیں۔ گھر بھی ان کے ساتھ ساتھ تھے۔ چشمے پر بھی پانی اکٹھے لینے جاتی تھیں پہلے ایک پھر دوسری پانی بھرتی۔ باری باری وہ دونوں ایک دوسرے کا گھڑا اُٹھا کے سر پر رکھتیں اور پھر باتیں کرتی ہوئی واپس چل پڑتیں۔ لیکن آج نہ جانے کیا ہوا، آج نہ جانے دونوں کو کیا جلدی تھی۔ ایک کہتی پہلے پانی میں بھروں گی، دوسری کہنے لگی، نہیں میں بھروں گی۔ شاید انھیں غصہ ایک دوسرے کے خلاف نہیں تھا۔ شاید غصہ انہیں اس لیے تھا کہ یہاں میٹھے پانی کا ایک ہی چشمہ تھا جہاں ندی کے سوکھ جانے کے بعد دور دور سے لوگ پانی لینے کے لیے آتے تھے۔ منہ اندھیرے ہی عورتیں گھڑا لے کے چل پڑتیں۔ جب یہاں پہنچتیں تو یا تو ایک لمبی لائن پہلے سے موجود ہوتی یا چشمے کے منہ سے ایک ایسی پتلی سی دھار کو نکلتے دیکھتیں جو آدھے گھنٹے میں مشکل سے ایک گھڑا بھرتی تھی اور تین کوس کا آنا جانا قیامت سے کم نہ تھا۔ لڑائی کی وجہ کچھ بھی ہو اصلی لڑائی پانی کی تھی۔ دونوں عورتوں نے دیکھتے

دیکھتے ایک دوسرے کے چہرے نوچ لیے، گھڑے توڑ دیے، کپڑے پھاڑ ڈالے اور پھر روتی ہوئی اپنے اپنے گھروں کو گیئں۔ تب سیداں نے سرزماں کو بھڑکایا اور عالیشاں نے ایوب خاں کو۔ دونوں خاوند غصے سے بے تاب ہو کے کلہاڑیاں لے کے باہر نکل پڑے اور پیشتر اس کے کہ لوگ آ کے بیچ بچاؤ کریں دونوں نے کلہاڑیوں سے ایک دوسرے کو ختم کر دیا۔ شام ہوتے ہوتے دونوں ہمسایوں کا جنازہ نکل گیا۔ ہمارے گاؤں کے قبرستان کی بہت سی قبریں پانی نے بنائی ہیں۔

میرے لڑکپن کے زمانے میں جب یہ دو قتل ہوئے اس وقت سامنے کے پہاڑ پہ ہی ایک میٹھے پانی کا چشمہ تھا۔ لیکن بعد میں جب میں اور بڑا ہوا تو یہاں ایک اور چشمہ بھی نکل آیا۔ اس نئے چشمے کی داستان بھی بڑی عجیب ہے یہ اس زمانے کا ذکر ہے۔ جب ہمارے پوٹھوہار میں سخت کال پڑا تھا اور گرمی کی وجہ سے علاقے کے سارے ندی نالے اور کنوئیں سوکھ گئے تھے۔ صرف کہیں کہیں ان چشموں میں پانی رہ گیا تھا جو پہاڑوں کی کھوؤں میں تھے، جہاں سورج کی روشنی کا گزر نہ تھا۔ ان دنوں ہمارے گھروں میں عورتیں رات کے دو بجے ہی اٹھ کے چل دیتیں اور چشمے کے نیچے ہمیشہ گھڑوں کی ایک لمبی قطار دکھائی دیتی۔ ایک لمبی پیاسی خالی گھڑوں کی قطار، جس میں سے پیاس سے بلکتے ہوئے بچوں کی صدا آتی تھی۔

اس زمانے میں بڑے بوڑھے لوگ نیکی اور خدا تی سے منحرف ہو گئے

اور ان لوگوں میں سب سے بُرا کام ذیلدار ملک خاں نے کیا۔ اس نے تھانیدار فضل علی سے مل کے اس چشمے پر پولیس کا پہرہ لگا دیا اور پھر تحصیل دار غلام نبی سے مل کے چشمے کے ارد گرد کی ساری زمین خرید کر راتوں رات اس پر ایک چار دیواری باندھ دی اور چار دیواری کے باہر تالا لگا دیا۔ اب اس چشمے سے کوئی آدمی بلا اجازت پانی نہ لے سکتا تھا۔ کیونکہ اب یہ چشمہ ذیلدار کی ملکیت تھا، اور ذیلدار نے چشمے سے پانی لے جانے والے گھڑوں پر اپنا ٹیکس رکھ دیا۔ ایک گھڑے پر ایک آنہ دو گھڑوں پر دو آنے۔

تب سارے گاؤں میں اس ظلم کے خلاف شور مچ گیا۔ لیکن پولیس اور سرکار ذیلدار ملک خاں کی حمایت میں تھی، قانون بھی اس کی طرف تھا۔ اور جدھر قانون تھا پانی بھی اُدھر تھا۔ اس لئے گاؤں کے سارے جوان اور بڈھے اور بچے جمع ہو کے میرے ابا کے پاس آئے اور بولے "چچا خدا بخش اب تم ہی ہمیں اس مصیبت سے نجات دلوا سکتے ہو۔"

"وہ کیسے؟" میرے ابا نے حیران ہو کے پوچھا۔

سفید ریش بڈھے حاکم خاں نے کہا۔ "یاد ہے یہ میٹھے پانی کا چشمہ جو اب ذیلدار ملک خاں کا ہو گیا، یہ چشمہ بھی تم نے دریافت کیا تھا۔ کیا تم دوسرا چشمہ نہیں ڈھونڈ سکتے؟ آخر اس پہاڑ کے اندر، اس کے سینے میں اور بھی تو کہیں میٹھا پانی ہو گا۔ جو انسان کو آبِ حیات بخش

سکتا ہے۔ خدا بخش تم ہم سب سے قابل ہو۔ اپنی عقل دوڑاؤ، ہم تمہارے ساتھ مارنے مرنے کو تیار ہیں۔ ہمارے گاؤں میں پانی نہیں ہے اور اب پانی چاہیے۔"

میرا ابا چار پائی پر اکڑوں بیٹھا تھا۔ اسی وقت اللہ کا نام لے کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ سارا گاؤں اس کے ساتھ تھا۔ پہاڑ پر چڑھائی تھی اور تلاش پانی کی تھی۔ فرہاد کی کوہ کنی سے پانی کی تلاش مشکل ہے یہ بات مجھے اس روز معلوم ہوئی کیونکہ پانی سامنے نہیں ہوتا وہ تو ایک چھلاوے کی طرح پہاڑ کی سلوٹوں میں گم ہو جاتا ہے۔ پانی خانہ بدوش ہے۔ آج یہاں، کل وہاں۔ پانی ایک پردیسی ہے جس کی محبت کا کوئی اعتبار نہیں۔ پانی کا وجود اس نازک خوشبو کی طرح ہے۔ جو تیز دھوپ میں اُڑ جاتی ہے۔ اس پوٹھوہار کے علاقے میں، جہاں عورتیں باوفا اور باحیا ہیں، پانی بے وفا اور ہرجائی ہے وہ کبھی کسی ایک کا ہو کے نہیں رہتا، کبھی ایک ٹھکانے پر نہیں ملتا، کسی ایک چشمے میں نہیں رہتا وہ ہمیشہ یہاں سے وہاں، ایک جگہ سے دوسری جگہ، ایک ملک سے دوسرے ملک میں گھومتا ہے، پاسپورٹ کے بغیر۔ ایسے ہرجائی کی تلاش کے لیے ایک تیشہ نہیں ایک ایسا آتیشہ چاہیے جس کے سامنے پہاڑ کا دل اس طرح ہو جیسے ایک کھلی کتاب۔ آخر میرے گاؤں والوں نے کچھ سمجھ کر میرے باپ کو اس کام کے لیے چنا تھا۔

اس روز ہم دن بھر اس بلند و بالا پہاڑ کی خاک چھانتے رہے

ہم نے کہاں اس پانی کو تلاش نہیں کیا! بیریوں کی گھنی جھاڑیوں میں، چٹانوں کی گہری درزوں میں، سیاہ ڈراؤنی کھوڈوں میں، جنگلی جانوروں کے بھٹ میں۔ پانی کی تلاش میں ہم نے سارے پرانے چشمے کھود ڈالے لیکن ان کا کھودنا ایسے ہی تھا جیسے آدمی زندگی کی تلاش میں قبریں کھود ڈالے۔ پانی کہیں نہیں ملا۔ ایک چور کی طرح اس نے جگہ جگہ اپنے جھوٹے سراغ چھوڑے لیکن آخر کو وہ ہمیشہ ہمیں جُل دے کر کہیں غائب ہو جاتا تھا۔ جانے فطرت کے کس کونے کے اندر کس مقام پر وہ کس گہرے غار میں بیٹھا ہوا اپنے چاہنے والوں پر ہنس رہا تھا۔

لیکن گاؤں والوں نے آس نہیں چھوڑی۔ وہ سارا دن میرے ابا کے پیچھے پیچھے پانی کی کھوج کرتے رہے۔ آخر جب شام ہونے کو آئی تو میرے ابا نے پسینہ پونچھ کر ایک اُونچے ٹیلے پر کھڑے ہو کر اِدھر نظر دوڑائی جدھر سورج غروب ہو رہا تھا یکایک انہیں غروب ہوتے ہوئے سورج کی روشنی میں چٹانوں کی ایک گہری درز میں فرن کا سبزہ نظر آیا اور کہتے ہیں جہاں فرن کا سبزہ ہوتا ہے وہاں پانی ضرور ہوتا ہے فرن پانی کا جھنڈا ہے اور پانی ایک گھومنے والی قوم ہے۔ پانی جہاں جاتا ہے اپنا جھنڈا ساتھ لے جاتا ہے۔

ایک چیخ مار کے جلدی سے میرے ابا اس طرف لپکے جہاں فرن کا سبزہ اُگا تھا۔ گاؤں والے ان کے پیچھے پیچھے بھاگے۔ جلدی جلدی

میں میرے ابا نے اپنے ناخنوں ہی سے زمین کو کریدنا شروع کر دیا۔ زمین، جو اُوپر سے سخت تھی، نرم ہوتی گئی، گیلی ہوتی گئی۔ آخر میں زور سے پانی کی ایک دھار اُوپر آئی اور سینکڑوں سوکھے ہوئے گلوں سے مسرّت کی آواز نکلی۔

"پانی! پانی!"

ابا نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اوک میں پانی بھرا۔ ساری نگاہیں ابا کے چہرے پر تھیں، سینکڑوں دل دھڑک رہے تھے۔ یا اللہ پانی میٹھا ہو، یا اللہ پانی میٹھا ہو۔

ابا نے پانی چکھا۔ "پانی میٹھا ہے۔" ابا نے خوشی سے کہا۔

گاؤں والے زور سے چلائے۔ "پانی میٹھا ہے!"

ساری وادی میں آوازیں گونج اُٹھیں۔ "پانی میٹھا ہے، پانی مل گیا، پانی میٹھا ہے!"

ساری وادی میں ڈھول بجنے لگے۔ عورتیں گانے لگیں، جوان ناچنے لگے، بچے شور مچانے لگے۔ گاؤں والوں نے جلدی سے چشمے کو کھود کر اپنے گھیرے میں لے لیا۔ اب چشمہ ان کے بیچ میں تھا اور وہ اس کے چاروں طرف تھے اور وہ اسے مڑ مڑ کر اس طرح محبت بھری نگاہوں سے دیکھتے تھے جیسے ماں اپنے نوزائیدہ بچے کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔

وہ رات مجھے کبھی نہیں بھولے گی۔ اس رات کوئی آدمی گاؤں

میں واپس نہیں گیا، اس رات سارے گاؤں نے چشمے کے کنارے جشن منایا۔ اس رات تاروں کی گود میں بھومی بیریوں کے ساتے میں ماؤں نے چولہے سلگائے، بچوں کو تھپک تھپک کر سُلایا۔ اس رات کنواریوں نے لہک لہک کر گیت گائے۔ ایسے گیت گائے۔ ایسے گیت جو پانی کی طرح نرمل اور سندر تھے، جن میں جنگلی جھرنوں کا ساحسن اور آبشاروں کی سی روانی تھی۔ اس رات ساری عورتیں حسین تھیں اور ساری زمین زرخیز تھی اور ساری جڑیں ہری تھیں اور سارے بیج تخلیق سے بے قرار ہو کر پھوٹ پڑے تھے۔

ایسی رات ہمارے گاؤں میں کب آئی تھی! جب ابا خدا بخش نے پانی ڈھونڈ نکالا تھا۔ پانی، جو انسان کے ہاتھوں کی محنت تھا اس کے دل کی محبت تھا۔ آج پانی ہمارے ہاں اس طرح آیا تھا جیسے بارات ڈولی لے کے آتی ہے۔ وہ نیا چشمہ ہمارے درمیان آج اس طرح ہولے ہولے شرمیلے انداز میں چل رہا تھا جیسے نئی دلہن جھجک جھجک کر اجنبی آنگن میں پاؤں رکھتی ہے۔ اس رات میرے ایک ہاتھ میں پانی تھا، دوسرے ہاتھ میں بانو کا ہاتھ تھا اور آسمان پر ستارے تھے۔

اس نئے چشمے کے ساتھ میری جوانی کی بہترین یادیں وابستہ ہیں۔ اس چشمے کے کنارے میں نے بانو سے محبت کی۔ بانو جس کا حسن پانی کی طرح نایاب تھا، جسے دیکھ کر ہمیشہ یہ خیال آتا تھا کہ جانے اس

زمین کی گود میں کتنے ہی میٹھے چشمے نہاں ہیں، کتنی حسین یادیں منجمد ہیں، موسم گرما کے کتنے ہی شوخ چمکتے ہوئے پھول، خزاؤں کے سنہری پتے، زمستان کی پاکیزہ برف۔ بانو کی محبت بھی کتنی خاموش اور چپ چاپ تھی، زمین کے نیچے بہنے والے پانی کی طرح وہ رات کے اندھیرے میں یا فجر سے بہت پہلے اس چشمے کے کنارے آتی تھی، جب یہاں اور کوئی نہ ہوتا میرے سوا۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر تبسم کی ضیا پھیل جاتی، جیسے اندھیرے میں سحر کا اُجالا پھیلتا ہے۔ وہ گھڑے کو چشمے کی دھار کے نیچے رکھ دیتی۔ پانی گھڑے سے باتیں کرنے لگتا اور میں بانو سے۔ دھیرے دھیرے باتیں کرتے ہوتے گھڑا بھر جاتا اور ہمارے دل خوشی سے معمور ہو جاتے اور ہمارے جانے بغیر کہیں دور سے صبح یوں دھیرے دھیرے چلتے ہوئے آتی جیسے بادِ نسیم سنگترے کے پھولوں کی سی انگلیاں لیے سوئے ہوئے چہروں پر سے گزر جاتی ہے اور ہم چونک کر اُٹھ کھڑے ہوتے اور حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگتے۔ پھر میں اس کا گھڑا اُٹھا کر اس کے سر کے اُوپر رکھی ہوئی سُرخ پٹی پر رکھتا اور وہ مسکرا کر، پلٹ کر اور گھوم کر ڈھلوان پر سے گزر جاتی اور میں اس کی طرف دیکھتا رہتا۔ اس وقت بھی دیکھتا رہتا جب دوسری عورتیں میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگتیں، اور مجھے وہ دن یاد آتا جب میں نے دادی اماں سے پوچھا تھا۔ "دادی! اماں عاشق کسے کہتے ہیں؟"

اور پھر اس چشمے کے کنارے مجھے وہ رات بھی یاد ہے جب میں

کان میں کام کرتا تھا اور دن بھر تھک کے گھر لوٹتا تھا اور اس تھکن سے چور ہو کر سو جاتا تھا۔ صبح ہی آنکھ کھلتی تھی۔ کئی دنوں سے میں بانو سے چشمے پر ملنے نہ گیا تھا مگر کوئی بے قراری نہ تھی۔ وہ ساتھ کے گھر میں تو رہتی تھی۔ انہی دنوں میں اس کے چچا کا لڑکا غضنفر بھی آیا اور چلا بھی گیا لیکن مجھے اس سے ملنے کی بھی فرصت نہ ملی کیونکہ کان میں نیا نیا ملازم ہوا تھا، کام سیکھنے کا بہت شوق تھا اور یہ تو ہر شخص کو معلوم ہے کہ نمک کی کان میں جا کے ہر شخص نمک ہو جاتا ہے۔

ایک رات بانو نے مجھے کہا کہ میں رات کے دو بجے چشمے پر اس سے ملوں۔ میں نے کہا۔ "میں بہت تھکا ہوا ہوں۔" وہ بولی۔ "نہیں ضروری کام ہے، آنا ہوگا۔" چنانچہ میں گیا۔

دو بجے کے وقت آدھی رات میں چشمے پر کوئی نہیں تھا، ہم دونوں کے سوا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

وہ دیر تک چپ رہی، پھر میں نے پوچھا۔ "بھئی بتاؤ، آخر کیا بات ہے؟"

وہ بولی۔ "میں گاؤں چھوڑ کر جا رہی ہوں۔"

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے چشمہ چلتا چلتا رُک گیا۔ میرے گلے سے آواز نکلی۔ "کیوں؟" "میری شادی طے ہو گئی ہے۔"

"کس سے؟"

"چاچا کے لڑکے کے ساتھ، جو لام سے ہو کے یہاں آیا تھا۔ وہ

چکوال میں ہے، صوبیدار ہے۔"

"اور تم جا رہی ہو!" میں نے تلخی سے پوچھا۔

"ہاں۔"

وہ چپ ہو گئی، میں بھی چپ ہو گیا۔ سوچ رہا تھا اسے ابھی جان سے مار دوں یا شادی کی رات قتل کروں۔ تھوڑی دیر رُک کے بانو پھر بولی۔ "سُنا ہے چکوال میں پانی بہت ہوتا ہے۔ سُنا ہے وہاں بڑے بڑے نل ہوتے ہیں جن سے جب چاہو ٹوٹی گھما کے پانی نکال لو۔"

اس کی آواز خوشی کے مارے کانپ رہی تھی۔ وہ شاید اور بھی کچھ کہتی لیکن شاید میری آزردگی کا خیال کر کے چپ ہو گئی۔

میں نے اس کے بالکل قریب آ کر اسے دونوں شانوں سے پکڑ لیا اور غور سے اس کی آنکھوں کی طرف دیکھا۔ اس نے ایک لمحہ میری طرف دیکھ کر آنکھیں جھکا لیں۔ اس کی نگاہوں میں میری محبت سے انکار نہیں تھا بلکہ پانی کا اقرار تھا۔ میں نے آہستہ سے اس کے شانے چھوڑ دیے اور الگ ہو کے کھڑا ہو گیا۔ یکایک مجھے محسوس ہوا کہ محبت سچائی، خلوص اور جذبے کی گہرائی کے ساتھ ساتھ تھوڑا سا پانی بھی مانگتی ہے۔ بانو کی جھکی نگاہوں میں اک ایسی جانگسل شکایت کا گریز تھا جیسے وہ کہہ رہی ہو، جانتے ہو ہمارے گاؤں میں کہیں پانی نہیں ملتا۔ یہاں میں دو دو مہینے نہا نہیں سکتی۔ مجھے اپنے آپ سے اپنے جسم سے نفرت سی ہو گئی ہے۔

بانو چپ چاپ زمین پر چشمے کے کنارے بیٹھ گئی۔ میں اس تاریکی میں بھی اس کی آنکھوں کے اندر اس محبت کے خواب کو دیکھ سکتا تھا جو گندے بدبودار جسموں، پسینوں جوؤں اور کھٹمل کی ماری غلیظ چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی محبت نہ تھی، اس محبت سے نہائے ہوئے جسموں، دھلے ہوئے کپڑوں اور نئے لباس کی مہک آتی تھی۔

میں بالکل مجبور اور بے بس ہو کر ایک طرف بیٹھ گیا۔

رات کے دو بجے۔ بانو اور میں دونوں چپ چاپ۔

کبھی ایسا سناٹا جیسے ساری دنیا خالی ہے، کبھی ایسی خاموشی جیسے سارے آنسو سو گئے ہیں۔

چشمے کے کنارے بیٹھی ہوئی بانو آہستہ آہستہ گھڑے میں پانی بھرتی رہی۔ آہستہ آہستہ پانی گھڑے میں گرتا ہوا بانو سے باتیں کرتا رہا، اس سے کچھ کہتا رہا، مجھ سے کچھ کہتا رہا۔ پانی کی باتیں انسان کی بہترین باتیں ہیں۔

بانو چلی گئی۔

جب بانو چلی گئی تو میرے ذہن میں بچپن کی وہ کہانی آئی۔ جب محبت روئی تھی اور آنسو نمک کے ڈلے بن گئے تھے۔ اس وقت میری آنکھ میں ایک آنسو بھی نہ تھا، لیکن میرے دل کے اندر نمک کے کتنے بڑے ڈلے اکٹھے ہو گئے تھے! میرے دل کے اندر نمک کی ایک پوری کان موجود تھی۔ نمک کی دیواریں، ستون، غار اور کھارے پانی کی

ایک پوری جھیل میرے دل اور دماغ اور احساسات پر نمک کی ایک پتلی سی جھلی چڑھ گئی تھی۔ اور مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اگر میں اپنے جسم کو کہیں سے بھی کھرچوں گا تو آنسو ڈھلک کر بہہ نکلیں گے اس لیے میں چپ چاپ بیٹھا رہا اور جب وہ میری طرف دیکھ کر ڈھلوان پر مڑ گئی اس وقت بھی میں چپ چاپ بیٹھا رہا کیوں کہ میرے پاس پانی نہیں تھا اور بانو پانی کے پاس جا رہی تھی۔

جس رات بانو کا بیاہ غضنفر سے ہوا اس رات میں نے ایک عجیب خواب دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ ہماری کھوئی ہوئی ندی ہمیں واپس مل گئی ہے اور نمک کے پہاڑ پر میٹھے پانی کے چشمے اُبل رہے ہیں اور ہمارے گاؤں کے مرکز میں ایک بہت بڑا درخت کھڑا ہے۔ یہ درخت سارے کا سارا پانی کا ہے۔ اس کی جڑیں، شاخیں، پھل، پھول پتیاں سب پانی کی ہیں اور اس درخت کی شاخوں سے، پتوں سے پانی بہہ رہا ہے اور یہ پانی ہمارے گاؤں کی بنجر زمین کو سیراب کر رہا ہے۔

اور میں نے دیکھا کہ کسان ہل جوت رہے ہیں، عورتیں کپڑے دھو رہی ہیں، کان کن نہا رہے ہیں اور بچے پھولوں کے ہار لیے پانی کے درخت کے گرد ناچ رہے ہیں اور بانو صاف ستھرے کپڑے پہنے میرے کندھے سے لگی مجھ سے کہہ رہی ہے۔

"اب ہمارے گاؤں میں پانی کا درخت اُگ آیا ہے۔ اب میں

تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔"

یہ بڑا عجیب خواب تھا لیکن میں نے جب اپنے ابا کو سنایا تو وہ مارے ڈر کے کانپنے لگے، بولے۔ "تم نے یہ خواب میرے سوا کسی دوسرے کو تو نہیں سنایا؟"

میں نے کہا۔ "نہیں ابا، مگر آپ ڈر کیوں گئے ہیں؟ یہ تو ایک خواب ہے۔"

وہ بولے۔ "ارے خواب تو ہے، مگر یہ ایک سُرخ خواب ہے۔"

میں نے ہنس کر کہا۔ "نہیں ابا، جو درخت میں نے خواب میں دیکھا وہ سُرخ نہیں تھا۔ اس کا رنگ تو بالکل ایسا تھا جیسے پانی کا ہوتا ہے وہ پانی کا درخت تھا۔ اس کا تنا، شاخیں، پتے سب پانی کے تھے۔ ہاں اس درخت پر پھلوں کی جگہ کٹ گلاس کی چمکتی ہوئی صراحیاں لٹکی تھیں اور ان میں پانی بچوں کی ہنسی کی طرح چمکتا تھا اور فواروں کی طرح اونچا جا کے گرتا تھا۔"

وہ بولے "کچھ بھی ہو یہ بڑا خطرناک سپنا ہے۔ اگر پولیس نے کہیں سن لیا یا تم نے کسی سے اس کا ذکر کر دیا تو وہ تمہیں اس طرح پکڑ کر لے جائیں گے جس طرح وہ ان مزدوروں کو پکڑ کر لے گئے تھے جنہوں نے ہمارے گاؤں کی ندی کو واپس لانا چاہا تھا اس لئے بہتر یہی ہے کہ تم اس خواب کا ذکر کسی سے نہ کرو۔ اسے بھول جاؤ جیسے تم نے یہ خواب کبھی نہ دیکھا تھا۔ کیونکہ اس خواب کا چرچا کرنے سے کچھ نہ ہوگا، سوکھی ندی ہمیشہ سوکھی رہے گی اور پیاسے سدا

پیاسے رہیں گے۔"

مجھے اپنے ابا کے لہجے کی حسرت ناکی آج تک یاد ہے۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ شروع شروع میں اس کا ذکر میں نے کسی سے نہیں کیا۔ لیکن جب چند دن گزر گئے تو میں نے ڈرتے ڈرتے اپنے کان کے چند مزدور ساتھیوں سے اپنے خواب کا ذکر کیا تو وہ میرا خواب سن کر ڈرنے کی بجائے ہنسنے لگے اور جب میں نے ان سے پوچھا کہ اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے تو انہوں نے کہا۔ "بھلا اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے۔ یہ خواب تو بہت اچھا ہے اور یہاں کان میں ہر ایک دیکھ چکا ہے۔"

"کیا سچ کہتے ہو! وہی پانی کا درخت؟"

"ہاں، ہاں۔ وہی پانی کا درخت گاؤں میں، ایک ٹھنڈے میٹھے پانی کا چشمہ ہر نمک کی کان میں!"

"گھبراؤ نہیں، ایک دن یہ خواب ضرور پورا ہوگا۔"

پہلے مجھے ان کی باتوں کا یقین نہیں آیا لیکن اپنے ساتھیوں کے ساتھ کام کرتے کرتے اب مجھے یقین ہو چلا ہے کہ ہمارا خواب ضرور پورا ہوگا۔ ایک دن ہمارے گاؤں میں پانی کا درخت ضرور اُگے گا اور جو جام خالی ہیں وہ بھر جائیں گے اور جو کپڑے میلے ہیں وہ دھل جائیں گے اور جو دل ترسے ہوئے ہیں وہ کھل جائیں گے اور ساری زمینیں اور ساری مجبنیں اور سارے ویرانے اور سارے صحرا شاداب ہو جائیں گے۔

سالگرہ

میرے بچے کی پانچویں سالگرہ تھی۔
ماں نے اسے نئے کپڑے پہنائے، دوستوں نے تحفے پیش کیے۔ دوسرے گھروں سے اور بھی بچے آئے تھے۔ میرا بچہ دن بھر ان سے کھیلتا رہا آم کھا کھا کر اپنے کپڑے میلے کرتا رہا، جامن چیکو کے درختوں پر چڑھنے کی کوشش کرتا رہا اور جب اس کے سارے دوست چلے گئے اور وہ بالکل تھک گیا تو سونے کے لیے میری گود میں آ بیٹھا۔
بچے نے پوچھا۔ "آج ماں نے ہمیں دن بھر پیار کیا۔ ایک بار بھی نہیں ڈانٹا۔ کیا بات ہے؟"
مَیں نے کہا۔ "آج تمہاری سالگرہ ہے۔"
وہ بولا۔ "تو پھر یہ سالگرہ ہر روز کیوں نہیں ہوتی؟"
مَیں نے کہا۔ "ہر روز کیسے ہو گی۔ تمہاری زندگی کا پانچواں سال ہے۔"
بچہ چپ ہو گیا۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد بولا۔
"آج نیا سال آیا ہے تو، تو پھر میرا پچھلا سال کدھر گیا؟"

سوال اتنا عجیب تھا کہ میں بالکل چکرا گیا۔ میں نے اپنی اور اپنے دوستوں کی اتنی سالگرہیں منائیں لیکن کسی کو یہ خیال نہ آیا کہ پچھلا سال کہاں جاتا ہے۔ نئے سال کی خوشی میں پچھلے سال کی یاد کسے آتی ہے۔ نئے دوست کے ملنے پر کون پرانے دوستوں کو یاد کرتا ہے۔ یہ تو دنیا کا دستور ہے۔

لیکن بچوں کا دستور دوسرا ہے۔

اس لئے بچے نے پھر مجھ سے پوچھا۔ "بتاؤ نا پچھلا سال کہاں گیا؟"

میں کیا بتاتا اسے! پانچ سال کے ننھے کو وقت کی گردش سمجھاتا! اس لیے میں نے خود ہی اس سے پوچھ لیا، کیونکہ جب میں اپنے بچے کے کسی سوال کو خود نہ بتا سکوں تو خود اس سے ہی پوچھ لیا کرتا ہوں۔

"تم خود بتاؤ ننھے پچھلا سال کہاں گیا؟"

ننھے کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ وہ بہت دیر تک مسکراتا رہا۔ آپ ہی آپ۔ میں نے دیکھا اس کی پلکوں پر نیند جھکی ہوتی ہے اور وہ کہیں بہت دور دیکھ رہا ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ مجھے سمجھاتے ہوئے بولا۔ "دیکھو وہ جامن کا پیڑ ہے نا جو ناریل کے درخت کے پاس۔"

"ہاں۔"

"وہ کنویں والا ناریل نہیں، آم کے پیڑ کے پاس جو ناریل کا درخت ہے۔"

"ہاں۔"

"بس اس جامن کے درخت کے اُوپر چڑھتے جاؤ۔"

"ہاں۔"

"اُوپر ہی اُوپر اور اُوپر۔"

"ہاں۔"

"اور اُوپر جہاں آسمان ہے نا وہاں تک جامن کا پیڑ جاتا ہے۔"

"اچھا۔"

"ہاں، اس کے اُوپر بچھلا سال رہتا ہے۔"

"ارے واہ۔ یہ تو نئی بات سُنائی تم نے! تم کیا جامن کے پیڑ پر چڑھے تھے؟"

بچے نے بڑی اداسی سے کہا۔ "نہیں، پیڑ بہت اونچا ہے۔ میں چڑھ نہیں سکا۔ مگر میں جانتا ہوں وہ وہیں پر ہوگا۔ اونچا، اونچا اور اُونچا، سب سے اُونچی جگہ پر۔"

پھر بچے کی پلکیں جھک گئیں اور وہ میری گود میں سو گیا اور میں اپنے سوتے ہوئے بچے کو اپنی گود میں لیے لیے سو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے کسی نے کندھے سے ہلا کر جگایا۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ ایک آدمی خوشنما لباس پہنے، سر پر ہیروں کا تاج رکھے میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

میں نے پوچھا۔ "تم کون ہو؟"

وہ بولا۔ "یاد کرو، اتنی جلدی بھول گئے؟"

میں نے کہا۔ "میں نے تم کو کبھی نہیں دیکھا بھائی۔"

وہ بولا۔ "میں تمہارا چوتھا سال ہوں۔"

میں جلدی سے گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کے ہاتھ پکڑتے ہی مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے چاروں طرف گہرا جنگل ہے۔ چیل اور دیو کے درخت ہوا کے جھونکوں سے سائیں سائیں کر رہے ہیں اور میں ایک سبز اور پیلے رنگ والی تیتری کا پیچھا کرتے کرتے ہوئے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں ہلاتا ہوا تیزی سے ایک طرف بھاگ رہا ہوں۔

تیتری موڑ پر سے کہیں غائب ہو گئی۔

میں موڑ سے گزر کر اس کی طرف بھاگا۔ اب تیتری میرے بالکل قریب تھی۔ میں نے ہاتھ پھیلا کر جھپٹا مارا مگر تیتری آگے اُڑتی چلی گئی اور ایک جھاڑی کے نیلے نیلے پھولوں پر ڈولنے لگی پھر وہ اُس کے پتوں میں چھپ گئی اس کے پروں کا سبز رنگ پتوں سے مل گیا، مگر اس کی پیلی دھاریاں کیسے مجھ سے چھپتیں؟ میں نے آہستہ سے ہولے ہولے گھٹنوں کے بل چل کے عین اس وقت، جب تیتری ایک نیلے پھول کو سونگھ رہی تھی، اپنا رومال اس پر رکھ دیا اور پھر اسے قید کر کے اپنی مٹھی کے خول میں رکھ لیا۔

تیتری کے پر ڈر کے مارے کانپنے لگے اور میں نے دیکھا کہ جنگل کے سارے درخت ایک دوسرے کے قریب ہوتے جا رہے ہیں، تنے سے تنے ملتے جا رہے ہیں اور تنوں کے پیچھے خوفناک آنکھیں — سبز

اور سیاہ اور سُرخ رنگ کی آنکھیں ـــــ چمک رہی ہیں اور میں ڈر کے مارے کانپ گیا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور اپنے چاروں طرف سیاہ جنگل کو پایا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ تیتری کے پیچھے بھاگتے ہوئے چلا تو میں اپنے باغ سے تھا لیکن بھاگتے بھاگتے جنگل میں آگیا۔ میں نے چلا کے کہا۔

"ماں! ماں!"

جنگل کے درختوں نے ہنس کے کہا۔ "ہا ہا ہا!"

"ماں، ماں، ماں!" میں اور بھی زور سے چلایا۔

"ہا ہا ہا ہا!" جنگل کے درخت اور بھی زور سے ہنسنے لگے۔

"چاہے تم کتنے بھی زور سے ہنسو" میں نے غصے میں درختوں سے کہا، "ہم خود اپنا راستہ ڈھونڈ لیں گے۔"

لیکن درخت بالکل ایک دوسرے کے قریب آگئے۔ تنے سے تنے لگ گئے، جھکی ہوئی ڈالیاں چھڑیاں بن گئیں اور راستہ تنگ سے تنگ اور چھوٹے سے چھوٹا ہوتا گیا۔ آخر کار ایک جگہ بنفشے کے پھولوں کی ایک بہت بڑی باڑ نظر آئی۔ یہاں آکر راستہ بالکل بند ہو گیا۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا، زمین سے آسمان تک بنفشے کے پھولوں کی دیوار تھی۔

"ماں ماں۔"

پھول زور زور سے کھلکھلا کے ہنسنے لگے۔

اتنے میں ایک بڑی خوبصورت پری آئی۔ اس کا لباس ایسا تھا۔ جیسے بنفشے کے پھولوں سے تیار کیا گیا ہو۔ اس کے دائیں ہاتھ میں نیلے پھولوں کی ایک چھڑی تھی جس کے سرے پر بنفشے کا ایک پھول تھا جو بالکل لال رنگ کے یاقوت کی طرح چمکتا تھا۔ اس نے آکر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور بولی۔

"بچے تم کیوں رو رہے ہو؟"

میں نے کہا۔ "میں ماں کے پاس جانا چاہتا ہوں؟"

پری بولی۔ "تمہاری ماں کہاں ہے؟"

"وہ جنگل کے اس پار ہے۔"

وہ بولی۔ "تو چلے چلو، تمہیں کون روکتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "اِدھر دیوار ہے اُدھر درخت راستہ نہیں دیتے اُدں اُدں اُدں۔"

"اُس نے میرے ہاتھ میں تیتری کو دیکھ لیا، بولی۔

"یہ کیا ہے؟"

میں نے کہا۔

"اوہو، اسے مت چھوؤ یہ میری تیتری ہے۔"

"تم اسے لے کر کیا کرو گے؟"

میں نے کہا۔ "میں اس کے پر اُتار کر اپنی تصویروں والی کتاب میں رکھوں گا۔"

وہ بولی۔ "پر اُتارو گے تو یہ مر جائے گی۔"

"مر جائے۔"

وہ بولی۔ "تو پھر اس کی ماں روئے گی۔"

مَیں نے پُوچھا۔ "اس کی ماں روئے گی؟"

"ہاں۔"

مَیں نے پُوچھا۔ "اس کی ماں کون ہے؟"

پری تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد بولی۔

"مَیں اس کی ماں ہوں۔"

مَیں دیر تک چپ رہا۔ تیتری کے پر بڑے خوبصورت تھے، مَیں نے اسے بڑی مشکل سے پکڑا تھا لیکن پری کی نیلی آنکھوں میں آنسو تھے جیسے کبھی کبھی میری ماں کی آنکھوں میں ہوتے ہیں۔ مَیں نے چپکے سے تیتری پری کی گود میں ڈال دی اور اپنا سر جھکا دیا۔

پری مسکرانے لگی اور پھر مَیں نے دیکھا وہ تیتری ایک چھوٹی سی پری بن گئی۔ جس کا لباس سبز رنگ کا تھا، گال پیلے تھے۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کے کہنے لگی۔ "تم مجھے بڑے اچھے لگتے ہو۔ مَیں تو تم سے کھیلنا چاہتی تھی لیکن تم تو مجھے جان سے مار رہے تھے۔"

مَیں نے کہا۔ "اب تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ تم میرے باغ میں آ کے مجھ سے کھیلا کرنا۔ مجھے معلوم نہیں تھا تم پری ہو۔"

پری کی ماں نے کہا۔ "بیٹا سب تیتریاں پر یا ہی ہوتی ہیں۔ جو بچوں

سے کھیلنے کے لئے گاؤں اور باغوں میں جاتی ہیں۔"

"اچھا!"

"ہاں۔ آؤ اب تمہیں گھر کا راستہ بتاؤں، نہیں تو تمہاری ماں روتے روتے مر جائے گی۔"

پھر پری نے پھولوں کی چھڑی سے اشارہ کیا اور تنوں سے تنے الگ ہوتے گئے، ڈالوں کی چھتریاں اونچی ہوتی گئیں اور آسمان نظر آگیا اور پھر جنگل کا کنارہ بھی آگیا اور میں نے دیکھا کہ میری ماں اور میرا باپ دونوں کہ ساتھ لیے مجھے ڈھونڈ رہے ہیں اور ماں بار بار پلو سے اپنے آنسو پونچھتی جاتی ہے۔

میں نے چلا کے کہا۔ "ماں میں یہاں ہوں۔ یہ دیکھو میرے ساتھ ایک پری بھی ہے۔"

میں نے مڑ کر دیکھا دونوں پریاں غائب تھیں۔ ہاں دور جنگل کی طرف ایک بنفشی رنگ کی تیتری کے ساتھ ایک سبز اور نیلے رنگ کی تیتری بھاگی جا رہی تھی۔

یکایک خوش نما لباس اور ہیروں کا تاج پہنے ہوئے آدمی نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور میری نظروں سے دور جنگل میں غائب ہو گیا۔ اس آدمی کے چہرے پر ایک جگمگ جگمگ کرتی مسکراہٹ آئی اور اس نے مجھ سے پوچھا۔ "یاد ہے۔"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "ہاں یاد ہے تم میرا چوتھا سال ہو۔ مگر تم کہاں

چلے گئے تھے؟"

وہ مجھ سے اور دور ہو گیا، بولا۔ "سات سمندر پار ایک جزیرہ ہے۔ اسے یادوں کا جزیرہ کہتے ہیں۔ میں وہاں رہتا ہوں۔ طوفانی لہروں پر بچے کبھی کبھی کاغذ کی کشتی کھیتے ہوئے آجاتے ہیں تو بڑی چہل پہل ہوتی ہے ورنہ وہاں ہر وقت نیند چھائی رہتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "مگر میرا بچہ تو کہتا ہے کہ تم جامن کے پیڑ کے اوپر رہتے ہو۔"

وہ بولا۔ "کبھی جامن کے پیڑ کے اوپر اور کبھی املی کے درخت کے نیچے، کبھی کھیت کے کنارے، کبھی کسی گلی کی نکڑ پر، جہاں جہاں بچے ہمیں بلاتے ہیں ہم پہنچ جاتے ہیں، اپنے خوابوں کے جزیرے سے نکل کر، کیونکہ وہ بچے ہیں بڑے نہیں ہیں۔ بڑوں کے لئے تو پرانا سال مر جاتا ہے اور نیا سال جنم لیتا ہے، لیکن بچے ہمیں ہمیشہ زندہ رکھتے ہیں۔ تمہیں یہ سن کر بڑی حیرت ہو گی کہ آج سے دو ہزار برس بلکہ پانچ ہزار برس پرانا سال بھی زندہ ہے، جس طرح وہ زندگی کے پہلے روز تھا۔ جس دن اس نے کسی بچے سے اپنا ہاتھ ملایا تھا، وہ تو ایک لمحے کے لیے بڈھا نہیں ہوا۔

آدمی مر جاتے ہیں لیکن سال ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔

وہ اتنی بات کہتے کہتے مجھ سے دور ہوتا گیا۔ برآمدے کی سیڑھیاں اُتر کے باغ میں چلا گیا اور اپنے چاروں طرف دھیمی، دھیمی، مدھم مدھم

جگنوؤں کی روشنی پھیلاتا گیا۔

میں نے چلا کر اس سے کہا۔ "سُنو، ایک بات بتاؤ۔ وہ سبز اور پیلے رنگوں والی پری اب کہاں ہے؟"

وہ ہنسا اور جامن کے درخت کے اوپر چڑھتا گیا، ہنستا گیا اور چڑھتا گیا۔ اُونچا، اونچا اور اُونچا۔ جامن کا پیڑ آسمان سے جا لگا اور وہ آسمان کی چھت میں غائب ہو گیا۔

یکایک میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے دیکھا میں اپنی آرام کرسی پر ہوں اور میرا بچہ خواب میں کسی کو دیکھ کر مسکرا رہا ہے۔

چاول چور

راشن کی دکان پر دو طرح کے چاول تھے۔ چاول نمبر ایک، چاول نمبر دو۔ چاول نمبر ایک دیکھنے میں اُجلے تھے، دو نمبر چاول موٹے، بھدے اور بھورے تھے اور ان میں سے چمڑے کی سی بو آتی تھی۔

ترلوچن کی ماں کو اچھے چاول بہت پسند تھے۔ اس لیے وہ دستر خوان پر بھورے چاول دیکھ کر بہت بگڑی۔ بہو سے بولی۔

"یہ تم چاول پکاتی ہو یا چپل کا تلا کاٹ کر کھلاتی ہو۔ لے جاؤ ان چاولوں کو میرے سامنے سے۔"

اس پر بہو نے کچھ کھسیا کر، کچھ گھبرا کر، کچھ لجا کر اپنے شوہر ترلوچن کی طرف دیکھا، پھر اپنی ساس کی طرف دیکھا اور پھر جلدی جلدی اُلجھے اُلجھے سانسوں میں بولی۔ "تو ماں جی میں کیا کروں۔ جب راشن کی دکان پر جاتی ہوں۔ جب یہی دو نمبر چاول ملتے ہیں۔ جب نمبر ایک چاولوں کے لیے پوچھو۔ جب یہی کہتے ہیں کہ وہ چاول تو ختم ہو گئے یا اب کی نہیں آئے یا اگلی بار آئیں گے۔ وہ اگلی بار کب آتی ہے؟ کیا معلوم؟ اب میں کیا کروں؟ آپ کے لیے وہ لبسی کی باسمتی کہاں سے لاؤں؟"

بسی کی باسمتی پر نرلوچن کی ماں چونک اٹھی۔ گو بہو کا لہجہ نرم اور ریشم میں لپٹا ہوا تھا۔ پھر بھی اس کے آخری نکیلے فقرے کی دھار نے ماں کے دل پر چوٹ پہنچائی کیوں کہ ماں موضع بسی، کوہ مری کی رہنے والی تھی جہاں ان کے شوہر جسونت سنگھ کی ایک چھوٹی سی زمینداری تھی۔ سردار جی کے انتقال کے دو برس بعد تک یہ زمینداری ماں کے قبضے میں رہی پھر ملک تقسیم ہو گیا اور پاکستان بنا اور ماں کو فسادات کے دنوں میں بسی سے بھاگ کر بمبئی آنا پڑا۔ ماں کو اپنا گھر، اپنی زمینداری چھوڑنے کا اتنا غم نہ تھا جتنا اپنے چاولوں کو چھوڑنے کا رنج تھا کیونکہ اسے اچھے اچھے چاولوں کو اپنے کھیتوں میں بونے کا بہت شوق تھا۔ کتنے اصرار سے وہ اپنے خاوند سے کہہ سن کے دور دور سے اچھے اچھے چاولوں کے بیج منگاتی تھی اور پھر پنیری کے سبزے سے دھان کے سنہرے خوشوں تک وہ ان چاولوں کی ہر منزل پر نگہبانی کرتی۔ اس انہماک، اس شدت، اس جذبے کے ساتھ آخر خود اس کا خاوند جھلا کر اس سے کہتا: "سردارنی چاول کھانے کے لیے یا بازار میں بیچنے کے لئے ہوتے ہیں، محبت کرنے کے لیے نہیں ہوتے" مگر سردارنی ایسا نہیں سمجھتی تھی۔ اسے واقعی چاولوں سے عشق تھا اس لیے اس موقعے پر وہ اپنی بہو کا ریشم میں لپٹا ہوا طعنہ برداشت نہ کر سکی، اس کی بوڑھی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ بھرائے ہوئے لہجے میں اپنے بیٹے نرلوچن سے مخاطب ہو کے بولی: "بہو مجھے باسمتی کا طعنہ دیتی ہے، تو بھی بتا تو بمبئی میں اتنے سال سے ہے تو نے کبھی ہماری بسی کی باسمتی سے

اچھے چاول کھاتے ہیں؟"

"نہیں ماں۔" ترلوچن نے آہستہ سے کہا۔

"اور بیگماں چاول بھی تجھے یاد ہوں گے۔ جب بیگماں کا دھان کھیتوں میں تیار ہو جاتا تھا تو کیسے سارا گاؤں اس کی خوشبو سے مہک اُٹھتا تھا بیگماں ایسے چاول پینے میں بھی نہیں ملیں گے۔"

ترلوچن نے پھر آہستہ سے سر ہلا کے کہا: "ہاں ماں، بیگماں چاول تو اب سچ مچ سپنوں کی طرح ہو گئے ہیں۔"

بیگماں چاولوں کے ساتھ خود ترلوچن کا بھی ایک شیریں سپنا بندھا ہوا تھا۔ ترلوچن نے آہستہ آہستہ یادوں کی پرانی رسی کو اُتارتے ہوئے اس سپنے کو کھولا تو اس میں سے راج کنور نکل آئی۔ لانبی، بانکی، حسین اور پلٹ کر حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ گویا کہہ رہی ہو: اچھا! تو میں سمجھتی تھی۔ تم نے مجھے بھلا دیا۔

راج کنور ایک ہاتھ میں درانتی، دوسرے ہاتھ میں بیگماں چاول کے سنہرے خوشے لیے کھڑی تھی۔ وہ اس کے کھیتوں میں چاول چرانے آئی تھی۔

ترلوچن نے پوچھا: "یہ تم کیا کر رہی ہو رات کے وقت ہمارے کھیتوں میں؟"

راج کنور چپ رہی۔

ترلوچن نے کہا: "یہ چوری ہے۔"

راج کنور نے کہا: "چوری نہیں مجبوری ہے۔"

ترلوچن نے کہا: "کیوں؟ کیا تمہارا باپ لال سنگھ فصل سے اپنا حصہ نہیں لے جاتا!"

راج کنور نے غصے سے کہا: "کتنا حصہ ملتا ہے؟ پہلے اس کی بات کرو، پھر یہ بتاؤ کہ بیگماں چاولوں میں سے ہمیں حصہ کیوں نہیں ملتا؟ ہمیں تو وہی موٹے، بھورے چاول ملتے ہیں۔ بیگماں چاول تو مالکوں کے لیے ہیں، مزارعوں کے لیے نہیں۔" ترلوچن چپ ہوگیا۔

اور راج کنور نے سوچا وہ یہاں کیوں آئی۔ وہ یہاں نہ آتی تو اچھا ہوتا مگر وہ کوئی بھی کیا کیونکہ دن کو تو ایسا برا محسوس نہیں ہوتا لیکن رات کو جب ہوا کھیتوں سے بیگماں کی خوشبو اڑا کر اس کے بستر پر لاتی تھی تو وہ بے چین ہو جاتی تھی، اسے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دھان کی ہزاروں بالیاں سرسراتی ہوئی اس کے کانوں میں کچھ کہہ رہی ہیں، جیسے دھان کے لاکھوں دانے اپنی آنکھیں کھول کر اس کی طرف تکتے ہیں اور اسے اپنے پاس بلاتے ہیں۔ ہر روز رات کو بیگماں چاول اسے اپنے پاس بلاتے تھے اور ہر روز وہ اپنے آپ کو روک لیتی تھی، مگر آج وہ نہ رک سکی اور درانتی ہاتھ میں لیے زمیندار کے کھیتوں میں چلی آئی۔ آخر یہ چاول میرے کیوں نہیں ہیں؟ وہ کھڑے ہوکر سوچنے لگی۔ میں نے انہیں بویا ہے، انہیں پانی، دھوپ، گرمی دی ہے۔ میں ان کے لیے پہروں، گھٹنوں پانی میں کھڑی رہی ہوں، گھنٹوں دھوپ میں جلا کی ہوں۔ میں نے انھیں بچوں کی طرح پالا ہے۔

آخر یہ چاول میرے کیوں نہیں ہیں؟

راج کنور نے دھان کی بالیوں کو اپنے رخسار سے لگا لیا اور نرلوچن سے کہنے لگی: "ہائے، کتنے اچھے ہیں یہ چاول! ایک ایک دانہ عطر میں بسا ہوا ہے۔ اب تم چاہو تو مجھے سردار جی کے سامنے۔ لے چلو یا پولیس میں دے دو۔ مگر میں تو آج فیصلہ کر کے آئی تھی کہ تمہارے کھیتوں سے بیگماں چاول لے کے جاؤں گی۔"

نرلوچن نے راج کنور کے ہاتھ سے درانتی چھین لی اور کھیت میں بیٹھ کر بیگماں کے اتنے پودے کاٹ ڈالے کہ راج کنور کی دونوں باہنیں دھان کے خوشوں سے بھر گئیں۔ راج کنور کے رخسار خوشی سے تمتما اٹھے۔ اس نے دھان کے خوشوں کے درمیان سے نرلوچن کو دیکھا اور بولی: "تم تو کالج میں پڑھتے ہو، درانتی چلانا وہاں سکھاتے ہیں کیا؟"

نرلوچن نے کہا: "کسان کا بیٹا ہوں۔"

راج کنور نے اپنے دونوں ہاتھوں میں دھان کے خوشوں کو دیکھا جنہیں وہ اپنے سینے سے لگائے ہوئے تھی۔ اس نے عجیب نگاہوں سے نرلوچن کی طرف دیکھا اور پھر کچھ کہے سنے بغیر وہاں سے بھاگ گئی۔

راج کنور کے جانے کے بعد نرلوچن کو یوں محسوس ہوا جیسے یہ رات ہے اور رات کا سناٹا ہے، آسمان پر چاند ہے اور چاند کے گرد ہالہ ہے سامنے خوبانی کا درخت ہے اور خوبانی کے درخت پر بلبل بول رہی ہے، چاروں طرف خوشبوؤں سے لدے دھان کے کھیت ہیں اور

کھیتوں کے کنارے کنارے لمبی ندی ہولے ہولے بہہ رہی ہے۔
مگر یہ سب کچھ اس نے راج کنور کے جانے کے بعد محسوس کیا۔
اب اس رات اتنا کچھ یاد کرنے کے بعد ترلوچن نے ایک بار سر ہلا کے کہا: "ہاں ماں تم سچ کہتی ہو، بیگماں چاول بہت ہی شیریں اور لذیذ ہوتے ہیں۔"

"اور تجھے یاد ہے؟" ماں نے مضطرب لہجے میں کہا،

"جب سردار جی ایک دفعہ سری نگر سے زعفرانی چاولوں کا بیج لے کے آئے تھے۔ یاد ہے کتنی محنت سے ہمارے مزارعوں نے وہ زعفرانی دھان ہمارے کھیتوں میں تیار کیا تھا۔ لوگ کہتے تھے زعفرانی چاول کوہ مری میں پیدا ہو ہی نہیں سکتا، اور اگر پیدا ہو گا بھی تو اس کی خوشبو مر جائے گی۔ لیکن جب دھان کھیتوں میں لہلہانے لگا تو دوسرے گاؤں تک زعفران کی خوشبو گئی تھی۔ ہمارے گاؤں والے خوشی سے پاگل ہو گئے تھے۔ یاد ہے جب وہ دھان پن چکی سے صاف ہو کے آیا تھا تو ہائے! کیسے بانکے، تیکھے، نکیلے، پتلے پتلے چاول اس میں سے نکلے تھے۔ چھوٹے چھوٹے مہین باریک چاول۔ لیکن جب ہانڈی میں ڈالو تو کیسے پھیل کے لمبے ہو جاتے تھے۔ ڈیڑھ ڈیڑھ پور کے لمبے چاول۔ یاد ہے ترلوچن؟"

ترلوچن کو اچھی طرح یاد تھا کیونکہ جس دن زعفرانی چاولوں کی فصل کٹی تھی اسی دن اس کے باپ سردار جسونت سنگھ نے اسے گھر سے باہر

نکال دیا تھا کیونکہ ترلوچن نے مزارعوں کو زعفرانی چاول کی فصل میں سے حصّہ مانگنے پر اُکسایا تھا۔ گاؤں میں صرف دو زمیندار تھے۔ سردار کلونت سنگھ اور جسونت سنگھ۔ موضع لبسی کی ساری زمین ان دونوں سرداروں کے پاس تھی۔ ترلوچن کا گناہ اگر صرف اتنا ہوتا کہ وہ صرف کلونت سنگھ کے مزارعوں کو حصہ مانگنے پر اکساتا تو خیر کوئی بات نہ تھی، جسونت سنگھ اسے معاف کر دیتا، مگر یہاں تو اس لونڈے نے خود اپنے باپ کے گھر میں بیٹھ کر اس کی زمینداری کو اُلٹنے کی کوشش کی تھی۔ مگر وہ تو خود کسان لوگ زمیندار کے ڈر کے مارے نہیں مانے۔ جو جھنجھوڑے سے تیار بھی ہوئے انہیں جھٹ زمیندار نے بے دخل کر دیا، اس سے وہ لوگ اور بھی ترلوچن کے خلاف ہو گئے۔ پھر جب ان زعفرانی چاولوں کی فصل کاٹنے کا زمانہ آیا تو ترلوچن نے ملک پیندا خاں اور ملک لال خاں اور دوسرے مزارعوں کو اس بات کے لیے تیار کر لیا کہ وہ زعفرانی چاولوں میں سے اپنا حصہ مانگیں۔

سردار جسونت سنگھ نے گرج کر کہا: "نہیں ملکا، نہیں لال خاں یہ نہیں ہوگا۔ تم لوگوں کو وہی چاول ملیں گے جو تم ہمیشہ لیتے آئے ہو۔" ملک لال خاں بولا: "وہی لال، موٹے، اجڑ چاول؟"

"ہاں، ہاں وہی موٹے اجڑ چاول جو تم ہمیشہ کھاتے ہو۔"

کھیتوں میں، جہاں یہ بات ہو رہی تھی، زعفرانی دھان کی سنہری بالیاں جگہ جگہ پڑی تھیں۔ ملک پیندا خاں ان کی طرف حسرت سے دیکھ کے

کہنے لگا: "سردار جی ہم نے ان پر بڑی محنت کی ہے، اپنے بچوں سے زیادہ محبت سے ان چاولوں کو پالا ہے، آخر ان پر ہمارا بھی تو کچھ حق ہے کچھ تو انصاف کرو۔"

اس پر ترلوچن سے نہ رہا گیا، اس نے باپ سے اجازت لیے بغیر وہیں سب کے سامنے مزارعوں میں زعفرانی دھان کے پودے تقسیم کرنا شروع کر دیے۔ اس پر اس کے باپ کو سخت غصہ آگیا۔ وہ گھر سے بندوق اٹھا لایا اور قریب تھا کہ اپنے بیٹے کو گولی کا نشانہ بنا دے کہ ترلوچن کی ماں دوڑی دوڑی آئی اور دوسرے مزارعے بھی بیچ میں آگئے۔ بڑی مشکل سے ترلوچن کی گلوخلاصی ہوئی مگر اسے گھر سے نکال دیا گیا اور مزارعوں کو بھی چاولوں کا ایک دانہ نہ ملا۔

ترلوچن نے وہ رات ملک پیندا خاں کے گھر بسر کی۔ صبح اٹھ کر وہ راج کنور کے گھر کی طرف چلا۔ اس کے ذہن میں صرف ایک خیال تھا کہ گاؤں چھوڑنے سے پہلے وہ ایک نظر راج کنور کو دیکھ لے مگر راج کنور اپنے گھر پر موجود نہ تھی۔ پتا چلا کہ وہ گوردوارے گئی ہے۔ ترلوچن گوردوارے پہنچا لیکن دہلیز پر رک گیا اور دہلیز کے باہر پڑے ہوئے جوتوں میں سے راج کنور کا جوتا تلاش کرنے لگا۔

گوردوارے کی دہلیز کے باہر بہت سے جوتے پڑے ہوئے تھے: اچھے جوتے، بُرے جوتے، نئے جوتے، پرانے جوتے، چھوٹے جوتے بڑے جوتے۔ ترلوچن ان میں سے بہت سے جوتوں کو پہچانتا تھا کیونکہ

انسان کے ہاتھ اور پاؤں جس چیز کو چھوتے ہیں اس میں اپنے کردار کا خاکہ، اپنے سماج کی تصویر، اپنے ماحول کی تفریق اس کا تضاد اور کشمکش بھر دیتے ہیں۔ جوتوں سے آدمی کسی کے بچپن کو مسکراتے ہوئے دیکھ سکتا ہے، کسی کی جوانی کا گیت سن سکتا ہے، کسی کے بڑھاپے کی جھریاں گن سکتا ہے۔ جوتے نہ صرف انسان کی عمر بتاتے ہیں اور جنس بتاتے ہیں بلکہ اس کے طبقے کا نام بھی بتاتے ہیں اور پبلک سیفٹی آرڈی نینس کے باوجود بتاتے ہیں کیونکہ بعض انسانوں کو توجیل اور پھانسی کا ڈر دلا کر جماعتی تفریق اور طبقاتی جنگ کی سچائی کے اظہار سے روکا جا سکتا ہے لیکن جوتوں کو کوئی نہیں روک سکتا۔ یہ جوتے بتاتے ہیں کہ ان کے پہننے والے معمولی کسان ہیں۔ یہ جوتے بتاتے ہیں کہ ان کے پہننے والے ان سے اونچے کسان ہیں۔ یہ پمپ شو سردار جسونت سنگھ کا ہے۔ یہ کریپ کا جوتا سردار کلونت سنگھ کا ہے۔ یہ سیاہ بوٹ تھانیدار حکم سنگھ کا ہے۔ یہ پشاوری طلائی چپل خوش حال چند پٹواری کی ہے۔ یہ جوتے باقی جوتوں میں الگ الگ اور خوش حال نظر آتے ہیں جیسے یہ دونوں زمیندار اور تھانیدار اور پٹواری گاؤں کے مزارعوں سے الگ الگ نظر آتے ہیں۔ جوتے نہ صرف سماج کا تضاد بتاتے ہیں بلکہ حکومت کا رعب بھی بتاتے اور زمیندار کی دولت بتاتے ہیں۔ جوتے کبھی کبھی اخبار کا کام بھی کرتے ہیں، مثلاً یہ گرگابی جیت کور کی ہے جس کا خاوند پچھلے ماہ فوج سے آیا ہے اور اس کے لیے یہ نئی گرگابی لایا ہے۔ یہ نیا جوتا ہرنام سنگھ کا ہے جس

نے بنیے سے قرض لے کر اپنی بیٹی کی شادی کی ہے اور اس خوشی میں یہ بنا جوتا بنوایا ہے۔ یہ ایک بیساکھی اور ایک فوجی جوتا رام سنگھ کا ہے جو جنگ میں دو ٹانگیں لے کر گیا تھا اور ایک ٹانگ لے کر واپس آیا ہے۔ یہ بیلبوٹا کس کا ہے؟ ہمارے گاؤں میں تو اس طرح کے جوتے نہیں پہنے جاتے ضرور کوئی اجنبی ہمارے گاؤں میں آیا ہے۔ ترلوچن نے سوچا۔ پھر اس کی نگاہ راج کنور کے سلیپر پر پڑی اور اس کی نگاہوں میں خوشی چمک اُٹھی۔ تو راج کنور بھی واقعی گوردوارے کے اندر ہے۔

ترلوچن گوردوارے کے باہر کھڑا کھڑا چند لمحوں تک سوچتا رہا کہ وہ گوردوارے کے اندر جائے کہ نہ جائے۔ اندر اس کا باپ تھا اور راج کنور بھی تھی۔ کبھی وہ اپنے باپ کے جوتوں کی طرف دیکھتا اور کبھی راج کنور کے سلیپر کی طرف۔ گاؤں میں خبر پھیل چکی تھی کہ زمیندار نے اپنے بیٹے کو گھر سے نکال دیا ہے۔ جب وہ گوردوارے کے اندر جائے گا تو لوگ اس کی طرف کس طرح دیکھیں گے! اس خیال سے بھی وہ رک گیا۔ یکا یک اسے ایسا معلوم ہوا جیسے دہلیز کے باہر سارے جوتے منہ اُٹھا کر اس کی طرف دیکھ رہے ہیں اور ہنس رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں: یہ زمیندار کا بیٹا ہے جسے ایک باپ نے اپنے گھر سے نکال دیا ہے۔ وہ ان کی طنزیہ نگاہوں کی تاب نہ لا سکا اور فوراً گوردوارے سے مڑ کر واپس چلا گیا۔ جاتے وقت اس نے بڑی حسرت سے ایک آخری نگاہ راج کنور کے سلیپر پر ڈالی اور پھر وہاں سے چپ چاپ چلا

گیا۔

نرلوچن خاموشی سے اپنے گاؤں سے رخصت ہو گیا اور پھر کبھی واپس نہیں گیا۔ گارڈن کالج راولپنڈی میں اب اس کا پڑھنا ناممکن ہو گیا تھا اس لیے وہ لاہور چلا آیا۔ اسے مصوری کا شوق تھا، یہاں پر وہ سردار گوپال سنگھ، کمرشل آرٹسٹ کے سٹوڈیو میں ملازم ہو گیا اور کام سیکھتا رہا۔ پھر لاہور سے وہ بمبئی چلا آیا کیونکہ بمبئی میں ایک اچھے کمرشل آرٹسٹ کے لئے میدان زیادہ وسیع تھا۔ یہاں آ کے تھوڑے ہی دنوں میں اس کا کام اتنا پسند کیا گیا کہ وہ اپنا سٹوڈیو کھولنے میں کامیاب ہو گیا۔ اب آٹھ سال سے وہ بمبئی میں مقیم تھا۔ یہیں اس نے ایک مراٹھی لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ مالا، جو اس کی ماں کی بہو تھی، اب اس کے چار بچے بھی تھے۔ اب وہ قریب قریب اپنے گاؤں کو بھول سا گیا تھا لیکن کبھی کبھی کسی گاؤں کی تصویر میں رنگ بھرتے ہوئے اس کے ذہن میں راج کنور کے سلیپر اُبھر آتے اور وہ سوچتا: جانے وہ چھوٹے چھوٹے سلیپر آج کہاں ہیں؟ جانے کس دہلیز کے کنارے کس کا انتظار کر رہے ہیں؟ آج وہ خود دوسرا تھا، اس کی دہلیز دوسری تھی وہاں پر کوئی اور ہی سلیپر پڑے ہوئے تھے۔ پھر بھی اس سے کیا ہوتا ہے۔ زخم بھر جاتا ہے لیکن زخم کی یاد تو نہیں بھرتی۔

اس لیے جب ماں نے اپنے بیٹے سے زعفرانی چاولوں کے بارے میں پوچھا تو بیٹا سر ہلا کے چپ ہو گیا۔ اس نے دو ایک لمحوں کے لیے

حیرت سے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ کتنے تعجب کی بات ہے ماں کو زعفرانی چاول یاد ہیں لیکن میرا گھر سے نکالا جانا یاد نہیں۔ مگر وہ اپنی ماں کی کمزوری اچھی طرح جانتا تھا اس لیے اس وقت چپ ہو رہا۔

ماں نے ہولے ہولے سر ہلایا اور اپنی بہو کی طرف دیکھ کر کہنے لگی:

"مالا تو مراٹھی لڑکی ہے تو ہمارے گاؤں کے چاولوں کی خوشبو کیا جانے تو نے کبھی ہماری بسی کی باسمتی کھائی ہوتی تو میں تجھ سے بات کرتی۔"

مالا نے جل کے کہا: "ماں ماں جی ہم نے تمہارا گاؤں دیکھا نہ تمہارے گھر کے چاول کھائے، اب ہم کیا جانیں کوئی سچ کہتا ہے یا جھوٹ۔" ماں نے کہا: "اچھا تو میں جھوٹی ہوں اور تو سچی ہے؟ ہاں ہاں ٹھیک ہے میں جھوٹی ہوں اور تو سچی ہے۔ کیونکہ تو گھر والی ہے اور میرا اب کوئی گھر نہیں ہے۔" ماں نے آبدیدہ ہو کے کہنا شروع کیا، "اب میرے کھیت میرے نہیں ہیں۔ بجلی پڑے ان چاول چوروں پر جنہوں نے میرے چاول مجھ سے چھین لیے ورنہ مجھے کیا ضرورت تھی کہ میں اس "ایگڑے تگڑے" کرنے والی لڑکی کے گھر آتی۔"

مالا نے اُنگلیاں نچا کر کہا: "واہ! میرے "ایگڑے تگڑے" پر حرف رکھتی ہو اور اپنے "ایتھے ویتھے" کو بھول جاتی ہو۔ یہ "ایتھے ویتھے" کیا بلا ہے؟ پنجابی زبان تو بالکل جنگلیوں کی زبان ہے۔"

ماں نے چلا کے کہا: "اور تیری مراٹھی زبان کیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے منہ میں پتھر ڈال کے بول رہے ہوں۔"

"پتھر پڑیں تیرے منہ میں۔"

"تیرے منہ میں۔"

مالا اور سردارنی دونوں اُٹھ کھڑی ہوئیں اور قریب تھا کہ گتھم گتھا ہو جائیں کہ نرلوچن بیچ میں آگیا اور ماں اور بہو دونوں کو ڈانٹنے لگا اپنی ماں اور دادی کو روتے دیکھ کر اور اپنے باپ کو اونچا بولتے دیکھ کر بچے بھی رونے لگے اور سب سے چھوٹی بچی راج کنور تو بالکل ڈر گئی (نرلوچن نے اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کا نام راج کنور رکھا تھا۔ محبت کیسے ایک سطح سے دوسری سطح پر آجاتی ہے۔ محبوب کی چاہت کیسے بیٹی کی اُلفت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ بڑا دلچسپ مشاہدہ ہے) نرلوچن نے راج کنور کو اپنی گود میں اُٹھا کر پچکارا، دلاسا دیا۔ بڑے بچے کو دادی نے سنبھالا اور دونوں منجھلے مالا کی ساری پکڑ کر رونے لگے۔ مالا انہیں پیار کرنے لگی اور ساس بہو دونوں اپنی لڑائی بھول گئیں۔

نرلوچن نے کہا: "آج نمائش میں جانا تھا، آج سٹوڈیو بند کیا، دوسرے سارے پروگرام ختم کر دیے، بچوں کو تیار کیا، اب تم دونوں یہ فساد لے کر بیٹھ گئی ہو۔ مالا کیا تم سے بھی چپ نہیں بیٹھا جاتا؟ ماں جی تو مزاج کی تیز ہیں، کیا تم ان کی خاطر اپنی زبان تھوڑی دیر کے لیے دانتوں تلے نہیں داب سکتیں؟"

"اچھا تو لو۔" مالا نے سچ مچ اپنی چھوٹی سی سرخ زبان کو دانتوں تلے دبا کے دکھایا۔ اس کی یہ ادا نرلوچن کو بہت پسند آئی۔ نرلوچن مسکرا

دیا۔ ماں بھی مسکرا پڑیں۔ مالا گو مراٹھی لڑکی تھی اور اس لیے غیر قوم کی تھی مگر بڑی حسین تھی۔ آج جب اس نے زبان دانتوں تلے داب کے دکھائی تو سردار نی کو وہ ایک بچی کی طرح معصوم، خوبصورت اور پیاری معلوم ہوئی۔ ماں اس کی اس ادا کو دیکھ کر بالکل بے اختیار ہو کر ہنس پڑیں۔ ساس کو ہنستے دیکھ کر مالا کا انداز بھی بدل گیا، اس نے جھٹ آگے ماں کے پاؤں چھو لیے اور ماں نے اسے فوراً گلے سے لگا لیا اور بھرائے ہوئے لہجے میں بولیں:

"واہگورو تیرا سہاگ سدا قائم رکھے! تُو تو میری ایک ہی بہو ہے، مجھ سے لڑا نہ کر۔"

"میں کہاں لڑتی ہوں۔" مالا اپنے آپ کو ماں کی آغوش میں چھپاتے ہوئے بولی۔

ترلوچن نے کہا: "اچھا تو ماں جی اب جلدی سے کھانا کھا لو نمائش میں دیر ہو رہی ہے۔"

ماں نے کہا: "میں ترلوچن میں نمائش دیکھنے نہیں جاؤں گی۔"

ترلوچن نے کہا: "بڑی اچھی نمائش ہے۔ روس، چین، چیکوسلواکیا، پولینڈ، ہنگری اور دوسرے ملکوں کا، جہاں لوگوں نے نئی زندگی شروع کی ہے، سب کا حال اس نمائش سے معلوم ہو جاتا ہے۔"

ماں نے پوچھا: "نئی زندگی سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

ترلوچن نے کہا: "میرا مطلب یہ ہے کہ جن جگہوں پہ لوگوں نے آزادی

حاصل کرنے کے بعد کس طرح اتنی اچھی زندگی بنائی ہے۔ نمائش میں اس کا پتا چلتا ہے۔ مثال کے طور پر چین کو لے لو۔ روس تو خیر بہت ترقی یافتہ ملک ہے مگر چین ہی کو دیکھ لو، مشکل سے دو برس گزرے ہیں آزادی حاصل کیے ہوئے مگر ان کی نمائش دیکھو تو معلوم ہوتا ہے یہ چین کے لوگ دو سال میں کہاں سے کہاں آگے نکل گئے ہیں۔"

ماں نے انکار میں سر ہلا کے کہا: "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ہم لوگ چار سالوں کی آزادی میں کچھ نہیں کر سکے، اب تک وہی بھورے اجرّ چاول کھا رہے ہیں، چینی لوگ کیسے اتنی جلدی آگے بڑھ سکتے ہیں؟ کیا ان کے چار ہاتھ ہیں یا چار پاؤں ہیں؟ کیا بات کرتے ہو تم بھی؟"

"نہیں ماں،" تر لوچن نے سمجھاتے ہوئے کہا، "چین کے لوگوں کا کام کرنے کا طریقہ ہم سے الگ ہے۔ وہاں پر سچ مچ لوگوں نے راج کا کام اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ انہوں نے زمینداری کو ختم کر کے ساری زمین کسانوں میں بانٹ دی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہاں اب سارے کسان سفید چاول کھاتے ہیں۔"

"تو پھر سیدھی طرح کیوں نہیں کہتا کہ چین والے بھی چاول چور ہیں۔ ہمارے چاول چھین کر خود کھاتے ہیں۔ بھلا میں ایسے چاول چوروں کی نمائش میں کیوں جانے لگی۔"

تر لوچن نے کہا: "ماں چین اور پاکستان اور ہندوستان کی بات ایک نہیں ہے۔ پاکستان میں تیری زمینداری ملک خاں اور پیندا خاں میں

نہیں بٹی اسے تو جالندھر کے پٹھان زمیندار شہباز خاں کے نام الاٹ کر دیا گیا ہے۔ صرف زمیندار کا نام بدلا ہے۔ زمینداری نہیں بدلی ہے بے شک گوردوارے کا پاٹھ ختم ہوا لیکن مسجد کی جوتیوں کا تضاد بدستور قائم ہے اور زعفرانی چاول والے اسی طرح بھورے چاول والوں پر حکومت کرتے ہیں کیونکہ جو یہاں ہندوستان میں نواب تھے وہاں جا کے بھی نواب رہے اور جو پاکستان میں راجہ تھے ہندوستان آ کے بھی راجہ رہے لیکن چین میں لوگوں نے ہماری طرح دھوکا نہیں کھایا، انہوں نے تو نوابی اور زمینداری کو ایک سرے سے ختم کر دیا ہے۔"

ماں نے مسکرا کے کہا: "تو لوچن تو شروع ہی سے چاول چوروں کا دوست رہا ہے اس لیے تو ان کی حمایت کرتا ہے، اسی لیے باپ نے تجھے گھر سے نکال دیا تھا۔ تیری باتیں وہی ہیں۔"

تو لوچن نے کہا: "ماں اب تو چلے گی یا بے کار بحث کرتی جائے گی۔"

"چلوں گی کیوں نہیں! اب گھر کے سب لوگ جا رہے ہیں تو اکیلی یہاں بیٹھ کے کیا کروں گی۔"

مالا نے کہا: "ہماری ہمسائی پشپا ناگ رتنا بھی چل رہی ہے اسے بھی ساتھ لے لیں۔"

نمائش میں پہنچ کر پشپا ناگ رتنا اور اس کا خاوند روسی نمائش گھر

دیکھنے چلے گئے۔ روسی نمائش گھر سب سے اُونچا، پُرشکوہ اور عمدہ تھا۔ اور مالا کی خواہش بھی تھی کہ سب سے پہلے روسی نمائش گھر کو دیکھا جائے مگر ماں سب سے پہلے چینی نمائش گھر دیکھنے پر مصر تھیں۔ کہنے لگیں: "میں بھی تو دیکھوں ان چینی لوگوں نے کیسے دو ہی سال میں اتنی ترقی کر لی ہے۔ مجھے بالکل یقین نہیں آتا اس لیے سب سے پہلے میں تو چینی گھر دیکھوں گی۔"

ترلوچن اپنی ماں، بیوی اور بچوں کو لے کر چینی گھر میں داخل ہوا آہستہ آہستہ ہر سیکشن سے گزرتے ہوئے اپنی ماں کو ہر بات سمجھائے جاتا تھا۔

"دیکھو ماں یہ چین کا کوئلہ ہے، یہ کچا لوہا ہے، یہ دونوں مانچوریا کی کانوں سے نکالے جاتے ہیں۔ مانچوریا چین میں ہے۔ چین میں لوہے اور کوئلے کی بڑی بڑی کانیں ہیں۔"

ماں نے کہا: "مگر ہمارے ہندوستان میں بھی لوہے، کوئلے کی بڑی بڑی کانیں ہیں۔"

ترلوچن نے کہا: "دیکھو یہ چین کے برتن کتنے خوبصورت ہیں۔"

ماں نے کہا: "مگر ہمارے مراد آباد کے برتن ان سے کم خوبصورت نہیں ہوتے۔"

ترلوچن نے کہا: "یہ چینی کپڑے، ریشم کے کپڑے سُوت کے کپڑے یہ دیکھو چینی بروکیڈ۔"

ماں نے کہا: مگر ہمارے یہاں بھی ریشمی، سوتی ہر طرح کا کپڑا تیار ہوتا ہے۔ بو وکیڈ ہمارے ہاں ہوتی ہے اور بنارس کی ساڑھی کا جواب دنیا میں کہیں نہیں ہے۔"

نرلوچن نے کہا: "یہ دیکھو دھان اور گیہوں کے خوشوں کا بنا ہوا سامان: خوبصورت پتلی چٹائیاں، ٹوپیاں، بکس، جوتے۔"

ماں نے کہا: "مگر یہ کیا نئی بات ہوئی۔ ہمارے بستی گاؤں کی کسان عورتیں بالکل ایسا سامان بناتی ہیں۔"

"یہ کاغذ کا سامان دیکھو، یہ ٹیبل لیمپ۔"

"مگر کشمیر کی پیپر ماشی اس سے عمدہ ہوتی ہے۔ یقین نہ ہو تو سری نگر میں جا کے دیکھ لو۔ میں ایک دفعہ سردار جی کے ساتھ سری نگر جا کے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی ہوں۔"

"یہ چمڑے کا سامان۔"

"مگر ــــ"

"فونٹین پین۔"

"مگر ــــ"

"مشینری ــ"

"مگر ــــ"

"گلوانومیٹر۔"

"مگر ــــ"

ترلوچن ہر چیز اُٹھاتا گیا اور ماں بڑے مزے سے "مگر" کہہ کے رد کرتی گئیں۔ وہ ان تمام چیزوں کو دیکھتے ہوئے بیچ بیچ میں اپنے ہونٹ خمیدہ کر کے کہتی گئیں: "مگر ہمارے ملک میں تو یہ چیز اس سے بھی عمدہ تیار ہوتی ہے۔"

ترلوچن کا غصہ اندر ہی اندر بڑھتا جا رہا تھا۔ عجیب عورت ہے اسے کوئی چیز پسند نہیں آتی۔ مگر وہ ماں سے نمائش گھر میں کیسے لڑ سکتا تھا اس لیے زہر کا گھونٹ پی کر چپ ہو رہا ہے۔ اب اس نے بددل ہو کر ماں کو چیزیں دکھانا چھوڑ دیا اور چپ چاپ اپنے خاندان کے ساتھ چلنے لگا حتیٰ کہ یہ لوگ چینی گھر کے آخری حصّے میں آن پہنچے۔ ترلوچن بڑی بے دلی سے اپنی ماں کے ساتھ چل تھا کہ یکایک اس نے دیکھا کہ اس کی ماں کے ہونٹوں سے خوشی کی ایک چیخ نکلی اور وہ دونوں ہاتھ پھیلائے آگے آگے دوڑی گئی۔

مالا نے گھبرا کر اپنی ساس کی طرف دیکھا کہ کیا ماجرا ہے اور پھر دوسرے ہی لمحے خود اس کے منہ سے بھی خوشی کی ایک چیخ نکل گئی اور وہ بھی اپنے خاوند اور بچے چھوڑ کر اپنی ساس کے پیچھے پیچھے بھاگی بھاگی گئی۔

سامنے ہزاروں من مکئی، ہزاروں من گیہوں اور ہزاروں من چاول کے بڑے بڑے انبار لگے تھے۔ اتنے بڑے بڑے انبار مالا نے تو خیر کبھی نہیں دیکھے تھے کیونکہ وہ بمبئی کی چالیوں میں پلی تھی لیکن ماں نے بھی، جس کی اپنی زمینداری رہ چکی تھی، اس نے بھی اپنی زندگی میں اتنا اناج کبھی ایک جگہ اکٹھا نہیں دیکھا تھا۔ ماں نے خوشی سے اپنے دونوں ہاتھ کنپٹیوں

تک چاول کے چمکتے ہوئے انبار میں ڈال دیے۔ ہاں، وہی مہین باریک
پتلے، بانکے چاول تھے جن کے لیے اس کی روح ترس گئی تھی۔ سچ مچ یہ
وہی چاول ہیں! ماں کو یقین نہیں آیا۔ وہ بار بار اپنی مٹھیوں میں ان
چاولوں کو بھر کر اوپر اچھالتی جیسے کوئی ماں انتہائی سرخوشی کے عالم میں
اپنے بچے کو ہوا میں اُچھالتی ہے اور پھر نیچے آتے ہوئے اسے اپنی آغوش
میں دبوچ لیتی ہے۔ ماں آج جیسی چاولوں سے اس طرح پیار کر رہی تھی کیونکہ
آج وہ اپنے کھیتوں میں واپس آئی تھی، آج اس کے سامنے دھان کے
خوشے تھے، آج گاؤں میں فصل کٹ رہی تھی، عورتیں نئی زندگی کے
گیت گا رہی تھیں۔ ماں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے کیونکہ آج اسے اپنے
چاول مل گئے تھے۔

نرلوچن نے دیکھا کہ صرف ایک اس کی ماں ہی ان غلّے کے انباروں
کے سامنے موجود نہیں ہے بلکہ بمبئی کی سینکڑوں مائیں اور بہوئیں اپنے
دلوں کی تشنہ کامی لیے وہاں کھڑی ہیں۔ ان کے سینے متضاد جذبات سے
متلاطم تھے۔ راشن کی دکان کے سامنے تیز جلتی ہوئی دھوپ میں لمبی
قطاریں، تھکے ہوئے مضمحل اور اداس قدم دھیرے دھیرے کچھوؤں
کی طرح اناج کی طرف بڑھتے ہوئے، بھورے بھورے، پیلے راشن کارڈ
جن پر ان کے نام مجرموں کی طرح لکھے ہوئے تھے اور آخر میں اس لمبی
قطار کے بعد ایک یونٹ چاول یا دو یونٹ چاول یا دو یونٹ گیہوں۔
اور جب وہ اس مٹھی بھر اناج کو جھولی میں اٹھا لیتیں تو سوچنے لگ جاتیں

یہ ہفتے بھر کا راشن ہفتے ہیں کتنے دن چلے گا! اس مٹھی بھر اناج سے وہ کس کس کی بھوک مٹائیں گی! اپنے بچوں کی، اپنے خاوند کی یا اپنے بوڑھے باپ کی۔ راشن دینے والے کیا یہ نہیں جانتے کہ بچوں کو تو بہت بھوک لگتی ہے؟ وہ دن میں ایک یا دو دفعہ نہیں دس دفعہ کھانا چاہتے ہیں۔ کیوں کہ ہاتھ پھیلنا چاہتے ہیں اور پاؤں بڑھنا چاہتے ہیں اور آنکھیں روشن ہونا چاہتی ہیں اور کلیاں پھول بننا چاہتی ہیں۔ لیکن راشن کی دکان پر صرف منجمد یونٹ ملتے ہیں۔ پھولوں کی شبنم اور صبح کا نور نہیں ملتا۔ وہاں خوراک نہیں ملتی تھوڑی سی تھوڑی بھوک ملتی ہے اور آہستہ آہستہ بڑھتی ہوئی موت ملتی ہے — ایک یونٹ یا دو یونٹ ان عورتوں کا سینہ ان تلخ یادوں سے گھٹا ہوا تھا۔ یکایک نند لوچن نے دیکھا کہ ایک بوڑھی عورت نے بے اختیار ہو کر اپنے رخسار گیہوں کے انبار سے لگا دیے اور اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اس کے چہرے پر بچوں ایسی نورانی طمانیت آگئی جیسے اس نے اپنی ساری زندگی کے راشن کارڈ پھاڑ ڈالے ہوں اور جیسے وہ ایک اس زندگی میں پہنچ گئی ہو جہاں انسان کی محنت گیہوں کی سنہری فراوانی پیدا کرتی ہے اور مکئی کی شہد آگیں شیرینی کو ہر تنے سے ہوتے ہونٹ پر پھیلا دیتی ہے۔ نند لوچن نے بڑی مسرت مسرت سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا جو اپنے بچوں کو دوسرے بچوں کے ساتھ اناج کے انباروں کے گرد ناچتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اس وقت سبھی عورتیں، مرد، بچے، بوڑھے ایک ہی سرخوشی سے سرشار معلوم ہوتے ہیں۔ نند لوچن نے دیکھا اس وقت ان کے چہرے پر وہ سارے سپنے ابھر

آئے ہیں جنہیں انھوں نے آج تک ناممکن سمجھ کر اپنے زندانی سینے کے تاریک گوشے میں قید کر رکھا تھا۔ اس وقت ان سب لوگوں کی نگاہیں بے اختیار نئے چین کو سلام کر رہی تھیں، اس نئی زندگی کو، اس نئی محنت کو سلام کر رہی تھیں جس نے اپنی متحدہ کاوش سے نئی زندگی کے انبار لگا کر ان کے سامنے رکھ دیے تھے اور دور دور کھڑے ہوئے نمائش گھر کے چینی کارکن بھی مسرت سے مسکرا دیتے تھے گویا زبانِ حال سے کہہ رہے تھے: "جو کچھ ہم نے کیا ہے وہ تم بھی کر سکتے ہو۔ تمہاری آنکھوں کے سپنے بھی سچے ہو سکتے ہیں لیکن یہ سپنے صرف دیکھنے سے سچے نہیں ہوتے۔ پہلے ان میں ہل چلانا پڑتا ہے، پھر ان میں اپنا خون بونا پڑتا ہے پھر کہیں جا کر سپنوں کی پہلی فصل سچی ہوتی ہے۔"

رات کو نو بجے وہ لوگ اپنے گھر پہنچے۔ راستے میں ماں بالکل خاموش رہی۔ تزلوچن نے بھی اپنی ماں سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ صرف کبھی کبھی کنکھیوں سے اپنی ماں کو کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا پاتا۔ گھر پہنچ کر مالا نے کواڑ کھولے، بتی روشن کی اور بچوں کی طرح ساس سے پوچھنے لگی:

"بچے بھوکے ہیں، اس وقت کیا پکاؤں جو جلدی سے تیار ہو جائے؟"

ماں نے کہا: "وہی بھورے چاول پکا لو، جلدی تیار ہو جائیں گے۔"

مالا نے پوچھا: "آپ بھورے چاول کھائیں گی، خفا تو نہ ہوں گی؟"

"نہیں۔" ماں نے بڑے اعتماد سے کہا۔

مالا مسکرانے لگی، بولی: "ماں جی اگر میں آپ کو آج سفید چاول کھلاؤں تو مجھے کیا انعام دیں گی؟"

یہ کہہ کر مالا نے اپنا پرس کھولا اور اسے تپائی پر اُلٹا دیا۔ چینی چاولوں کے دانے تپائی پر بکھر گئے۔ ایک مٹھی چاول۔

ترلوچن حیرت سے مالا کی طرف دیکھنے لگا۔

اتنے میں اس کا بڑا بیٹا آگے آیا، اس نے اپنی جیبوں کو ٹٹولا اور دو مٹھی چاول نکال کر تپائی پر رکھ دیے۔ پھر منجھلا بیٹا ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا اور اس کے بعد چھوٹا منجھلا بیٹا دونوں کی جیبوں سے وہی چاول نکلے۔ تپائی پر سفید چاولوں کی ایک ڈھیری سی بن گئی۔ پھر چھوٹی لڑکی راج کنور نے اپنے ننھے ہاتھوں سے اپنی فراک کی ننھی سی جیب کو ٹٹولا اور اس میں سے سفید سفید چاول نکال کر اپنی ننھی مٹھی بھری اور ماں جی کو دکھا کر بولی: "میں بھی نانول آئی ہوں۔ دیکھو ماں جی، میں نانول آئی ہوں۔" اب سب بچوں کی نظریں مالا اور ترلوچن کی نگاہیں ماں پر تھیں۔ ماں ان نگاہوں کا بوجھ نہ سہار سکیں، ان کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا، پھر ان کی آنکھیں خود بخود جھک گئیں، پھر انہوں نے اپنی انگلیوں کو بے چین پا کر انہیں اپنے دوپٹے کے

پلو کو ٹٹولنے دیا اور خود بنجو دپلو کے کونے سے ایک مٹھی چاول سرک کر تپائی پر آگرے۔

تر لوچن نے مسکرا کے کہا: "ماں تم بھی! چاول چور!"

ماں سر جھکا کر خاموش ہو گئی۔ بہت دیر تک خاموش رہی، پھر اس نے آہستہ آہستہ اپنا سر اُٹھا کے اپنے بیٹے سے کہا: "آج مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ تم لوگ چاول چور نہیں ہو، تم چاول پیدا کرنے والے ہو اور تھوڑے چاولوں کو بہت سے چاولوں میں اور بھورے چاولوں کو سفید چاولوں میں تبدیل کرنے والے ہو اور اگر اس پر بھی دنیا تمہیں چاول چور کہتی ہے تو کہے میں آج سے تمہارے ساتھ ہوں، واہگورو، تمہیں فتح دے۔" یہ کہہ کر ماں نے تر لوچن کو گلے سے لگا کر اس کا ماتھا چوم لیا۔ تر لوچن کا چہرہ کھل اُٹھا، مالا خوشی سے مسکرانے لگی۔ بچے سفید چاولوں کو تپائی پر دیکھ کر خوش ہو رہے تھے اور چیخ رہے تھے اور تالی بجا رہے تھے۔ یہ شور سن کر مالا کی ہمسائی پشپا ناگ رنتا بھی اندر آئی: "کیا ماجرا ہے؟ آج کس بات کی خوشی ہے؟"

مالا نے کہا: "آج ہمارے گھر ایک چینی مہمان آیا ہے۔" مالا نے یہ کہہ کر تپائی پر پڑے ہوئے سفید چاولوں کی طرف اشارہ کیا۔

ناگ رنتا نے ان چاولوں کی طرف دیکھا، پھر مالا کی طرف دیکھا اور مسکرا کے بولی: "آج یہ مہمان ہمارے گھر بھی آیا ہے۔"

امریکہ سے آنے والا ہندوستانی

ایک روز کا ذکر ہے میں چرچ گیٹ سٹیشن سے نکل کر ہوٹل کی جانب فٹ پاتھ پر سر جھکائے چلا جا رہا تھا کہ یکایک کسی نے میرے بالکل قریب آکر چلا کر کہا: "ہائی کڈ۔"

میں زمین سے دو فٹ اوپر اُچھل گیا۔ اُچھلنے کے بعد جو نیچے گرا ہوں تو میرے قدم فٹ پاتھ پر نہیں تھے بلکہ چیخنے چیخنے والے کی ٹوکری پر دوسرے لمحے میں ٹوکری اوندھی ہو گئی، چیخنے فرش پر پھسل گئے اور چیخنے والا مجھے گالیاں دینے لگا۔ ابھی میں مڑ کے دیکھ بھی نہ پایا تھا کہ اتنی اُونچی آواز میں کون چلا رہا ہے کہ کسی نے زور سے میری پیٹھ پر ہاتھ مار کر کہا: "ہائی مسکہ۔"

اب جو میں غصے میں گھوم کر دیکھتا ہوں تو ایک نوجوان نیلے رنگ کی شارک سکن کی پتلون پر گلابی رنگ کا بش کوٹ پہنے، جس پر سبز رنگ کے تربوز منقش تھے، میری طرف دیکھ کے ہنس رہا ہے۔ میں اس قدر غصے میں تھا کہ چند لمحوں کے لیے میں نے اسے بالکل نہیں پہچانا۔ میرے

غصے کا ناجائز فائدہ اُٹھا کر اس نوجوان نے ناک میں گنگنا کے پھر کہا۔

"جگ موہن لال کا لپٹر یا۔"

یکا یک میں نے اسے پہچان لیا۔ "ارے۔" میرے منہ سے نکلا۔
"ارے لونچڑ تم ہو!" میں مسرت سے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے
بولا۔ جگ موہن کا لپٹریا! ہاہا! یہاں ہم سب اس نوجوان کو انتہائی پیار سے
لونچڑ کہتے تھے۔ گھر والے جگ یا جگ جگ۔ حتیٰ کہ اس کی بیوی بھی اسے جگجی
کہہ کے پکارتی تھی۔ جو آپ سمجھ جائیں گے کہ لونچڑ سے بہت دور نہیں تھے۔
خیر میں نے اپنے غصے کو دور کرتے ہوئے اسی سے پوچھا:
"کوئی تین سال سے تمہیں نہیں دیکھا، کہاں تھے تم؟"

"سٹیٹس میں۔"
(امریکہ سے آنے والا ہر آدمی امریکہ کو سٹیٹس کہہ کر پکارتا ہے —
"سٹیٹس" کو یہ لوگ کیا کہیں گے، اس کے متعلق میں کچھ معلوم نہیں کر
سکا۔)

"وہاں کیا کرنے گئے تھے؟"
"ہوٹل میں چلو سب بتاؤں گا، اولٹر پارک میں ٹھہرا ہوں۔"
ہم دونوں اولٹر پارک کی جانب چلنے لگے۔ اتنے میں چنے والے نے
کہا: "عجب شانِ خدائی ہے۔"
"کیا بات ہے بھائی؟" میں نے بڑی متانت سے چنے والے سے
پوچھا۔

"ارے صاحب آپ نے میری ٹوکری توڑ دی، میرے چنے بکھیر دیے میری کوئلوں کی ہنڈیا لڑھکا دی، اب پوچھتے ہو کیا بات ہے؟" چنے والا بازو ہلاتے ہوئے بولا۔

لونچڑ نے اپنی پتلون کی جیب کا زپ کھولا، اس کے اندر ایک پیلے رنگ کا بٹوا تھا، اس کا زپ کھولا اور اس میں سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر چنے والے کو دے دیا۔ چنے والا بڑے غور سے پانچ روپے کے نوٹ کو دیکھنے لگا کہ شاید اس نوٹ میں بھی کہیں کوئی زپ نہ لگا ہو پھر اچھی طرح اطمینان کرنے کے بعد اس نے نوٹ کو جیب میں ڈال لیا۔ اور جب ہم آگے چلے گئے تو ہماری طرف زور سے قہقہہ لگا کر کہنے لگا:

"عجب شانِ خدائی ہے۔"

جب ہوٹل کے کمرے میں پہنچ کر ہم لوگ اطمینان سے بیٹھ گئے تو مجھے اچھی طرح دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ واقعی پہلے سے صحت مند ہو گیا تھا اور موٹا بھی اور اب وہ بہت تیز تیز باتیں کرنے کا عادی ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے، جب وہ ہندوستان میں تھا، تو سیدھے سادھے انداز میں حلق سے یا منہ سے باتیں کرتا تھا، مگر اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر فقرہ جو وہ بول رہا تھا حلق سے نکل کر ناک کی نالیوں میں گھس جاتا ہے اور وہاں سے گھومتا ہوا نتھنوں کی راہ باہر نکلتا ہے جس سے فقرے کی ساخت میں ایسی گولائیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو زبان کو نیا حسن بلکہ اکثر اوقات جملوں کو بالکل نیا مطلب عطا کرتی ہیں۔ میں بہت دیر تک اس کی باتیں بلکہ اس کی باتوں کی گولائیاں سنتا رہا، یہ دھیان

دیے بغیر کہ ان گولائیوں کے اندر کیا ہے۔ اس دوران میں مجھے اس کا وہ زمانہ یاد آگیا جب موہن اور ہم دونوں منٹگمری کے ایک سکول میں پڑھا کرتے تھے۔ جب جگ موہن ایک بڑی پگڑی اور تہمد باندھے سکول میں پڑھنے کے لیے آیا کرتا تھا اور سب لوگ اس پر ہنسا کرتے تھے اور شریر بچے اس کی طرف اُنگلی اُٹھا اُٹھا کر کہتے تھے:

لونچڑ دین　　بجاوے بین
تہمد موٹا　　پگ مہین

اس وقت بھی لوگ جگ موہن کو لونچڑ کہا کرتے تھے۔

اس وقت میں اس کی باتیں سنتے سنتے وہی گیت زور زور سے گنگنانے لگا۔

جگ موہن باتیں کرتا کرتا چپ ہو گیا، پھر ایک وقفے کے بعد شکایتاً بولا: "بھئی اب تو مجھے لونچڑ نہ کہو، اب تو میں سٹیٹس سے ہو آیا ہوں، ٹرینینگ لے کے آیا ہوں۔" "کاہے کی ٹرینینگ لے کے آئے ہو؟"

"تیل نکالنے کی۔"

"کس کا تیل نکالنے کی؟"

"کاجو کا تیل نکالنے کی ٹرینینگ۔"

"کاجو سے تیل یہاں بھی تو نکل سکتا ہے؟"

"نکل سکتا ہے مگر امریکہ میں تیل بہت اچھی طرح نکلتا ہے۔"

"اوہ!"

اس کے بعد اس نے گفتگو کا رخ بدلنے کے لیے مجھے وہ چیزیں دکھائیں جو وہ امریکہ سے لایا تھا۔ جو وہ امریکہ سے لایا تھا جوتوں کے دس بارہ جوڑے تھے۔ ان جوتوں میں فیتے کی بجائے لوہے کی مہین زنجیر جسے زپ کہتے ہیں، لگی ہوئی تھی۔ جوتا پہن کر زنجیر اُوپر کھینچ لینے سے جوتا پاؤں میں خود بخود فٹ ہو جاتا ہے۔ سامنے پتلونوں میں بھی بٹن کی بجائے زپ لگی ہوئی تھی۔ کوٹ کی جیبوں میں بھی زپ لگی ہوئی تھی۔ قمیضوں اور سوئیٹروں سے لے کر جرابوں تک زپ لگی ہوئی تھی۔ پھر اس نے مجھے کیلنڈر دکھائے جن میں ہر مہینے کے صفحے پر ایک ننگی امریکی عورت کی تصویر تھی۔

مگر میں نے حیرت سے کہا: "بھئی ان عورتوں کی زپ کہاں ہے؟ یہ تو بالکل ننگی ہیں۔"

اس نے مسکرا کر کیلنڈر بند کیا اور پھر اس کے اُوپر ایک زپ چڑھا دی اور کہنے لگا: "دیکھو یہ رہی، اب کہو امریکہ عالی شان ملک ہے کہ نہیں۔"

"واقعی لونچر۔" وہاں جواب سے لے کر عورت تک ہر شے لوہے کی زنجیر میں بندھی ہوئی ہے۔"

"شوئر، شوئر ( )۔" جگ موہن بات کو نہ سمجھتے ہوئے بھی سر ہلانے لگا۔

لونچر ہر بات میں شوئر، شوئر ( ) اور فائن ( ) کہتا تھا اور جب کوئی چیز اسے بہت پسند آجاتی تو زور سے "ہیکی"

کہنا۔

چنانچہ اس کی پتلونیں فائن تھیں اور سویٹر ہکی، اس کی قمیضیں فائن تھیں اور اس کے بش شرٹ ہکی، اس کے جوتے فائن تھے اور اس کی ٹائیاں ہکی، اور "ہکی" کے آگے اگر کوئی لفظ ہے تو ریس کورس کا ہکی ہے۔ مگر کبھی کبھی....

پھر لونچر کی ٹائیاں بڑی خوبصورت تھیں۔ یہ دوسری ٹائیاں تھیں یعنی سیدھی بھی پہنی جاسکتی تھیں اور اُلٹی بھی۔ اس کے علاوہ ان پر عجیب وغریب نقش ونگار بنے ہوئے تھے۔ کچھ ٹائیاں تو ایسی تھیں جو پرانی چھینٹوں کے کپڑوں کو کاٹ کر تیار کی گئی تھیں، کچھ ٹائیوں پر پرانے غالیچوں کا دھوکا ہوتا تھا، کچھ ٹائیوں سے معلوم ہوتا تھا بچوں نے اپنے ہاتھ سے رنگی ہیں، کچھ ٹائیوں کی گانٹھ اس قدر موٹی آتی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ گدھے کی گردن میں باندھنے کے لیے تیار کی گئی ہے۔

لونچر نے ایک ٹائی مجھے دکھائی: اس پر ایک طرف الغامی معمہ بنا ہوا تھا، دوسری طرف زنانہ خواب گاہ کے اندر ایک عورت سو رہی تھی۔

میں نے پوچھا: "یہ کیا ہے؟"

وہ بولا: "یہ دانشوروں کی ٹائی ہے۔"

"وہ کیسے؟"

وہ بولا: "تم بوجھو۔"

میں نے کہا: "میں امریکی دانشور ہوتا تو بوجھ لیتا، اب تم کو بتانا

پڑے گا۔"

وہ بولا: "شوئر، شوئر۔ دیکھو یہ ٹائی کہتی ہے: دن کو معمہ حل کرو، رات کو کسی کی خواب گاہ میں گھس جاؤ۔"

"سبحان اللہ! کیا دانشوری ہے۔" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"اور یہ ٹائی دیکھو۔"

یہ ایک دوسری ٹائی تھی۔ اس کے ایک طرف پائپ میں سے دھواں نکل رہا تھا، دوسری طرف دو اونچی ایڑی کے جوتے تھے۔ ایک ٹائی کے زیریں حصے پر، دوسرا بالکل اوپر اور دونوں ایڑیوں میں دس انچ کا فاصلہ تھا۔

اس نے کہا: "بوجھو یہ کیا ہے؟"

میں نے سوچ سوچ کر کہا: "یہ ٹائی کہتی ہے تمباکو نوشی کرو گے تو بیوی پیٹے گی۔"

"ہا ہا ہا!" لونچڑ ہنستے ہوئے بولا، "تم بالکل گونگ کا نزا ہو، ایک دم گونگ کا نزا ہو۔"

میں نے غصے سے کہا: "اور تم ایک دم لونچڑ، ایک دم لونچڑ۔"

وہ میری پیٹھ تھپکتے ہوئے بولا: "دیکھو غصے میں مت آؤ، یہ ٹائی شام کے وقت پہنی جا سکتی ہے۔ جب شراب پینے کے لیے بار میں جاؤ تو اس پائپ والے حصے کو سامنے کر لو۔ شراب پیو اور خوبصورت

لونڈیوں کی براق ٹانگوں کی طرف دیکھو اور پھر جو پسند آجائے تو ٹائی کا حصّہ بدل کر اس کے ساتھ ڈانس کرو۔ ڈانس سمجھے؟ ڈانس یعنی ایک ایڑی اوپر، ایک ایڑی نیچے، بیچ میں دس انچ کا فاصلہ، سامبا ناچ کی طرح۔ ہا ہا ہا!"

اس کے بعد اس نے بش کوٹ اُتار کر ایک امریکی قمیض پہن لی جس کے ( ) کالر ایک دوسرے سے زاویہ منفرجہ بناتے ہوئے اتنے الگ ہو جاتے تھے کہ ان کے بیچ ایک چھوڑ تین ٹائیاں لٹکائی جا سکتی تھیں۔ مگر میرے دوست نے اسی وقت وہی اونچی ایڑیوں والی اور دھواں نکالنے والے پائپ کی ٹائی پہننے پر اکتفا کی اور چونکہ اب شام ہو چکی تھی اور ابھی بمبئی میں امتناعِ شراب نوشی کا قانون نافذ نہ ہوا تھا اس لیے وہ مجھے اپنے ہوٹل کی سپیشل بار میں لے گیا۔

وہ بولا: "تم کیا پیو گے؟"

میں نے کہا: "صرف وسکی پیوں گا اور اگر زیادہ مجبور کرو گے تو اس میں تھوڑا سا سوڈا ڈال لوں گا۔"

وہ بولا: "کیا خشکی ڈرنک ہے۔ اسے صرف انگریز یا نیم انگریز ہندوستانی پیتے ہیں۔ اس سے تو یہی بہتر ہے کہ تم کوکا کولا پیو اور چیونگم کھاؤ۔"

"غم تو میں روز کھاتا ہوں۔" میں نے جواب دیا، "کوئی نئی

بات بتاؤ۔"

وہ بولا: "بوائے، او بوائے۔ آج تمہیں ایک نئی امریکی کاک ٹیل پلاتا ہوں۔"

اس کے بعد وہ اپنی مگر مچھ کی پیٹی سہلاتا ہوا بار مین کے پاس چلا گیا اور نہ جانے اسے کیا انٹ سنٹ شرابیں ملانے کو کہتا رہا بہرحال جب پندرہ بیس منٹ کے بعد وہ مسرت سے ہاتھ ملتا ہوا میرے پاس آیا تو بیرے نے دو جام ہمارے سامنے لا کے رکھے ان میں بھورے رنگ کا سیال تھا جو شراب سے زیادہ گھوڑے کے پیشاب سے مشابہت رکھتا تھا اور ان کے اندر زیتون کا ایک ایک میوہ پڑا ہوا تھا۔

اس امریکی کاک ٹیل کا مزہ کڑوا، میٹھا، بکسا، متلی آمیز تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ کاک ٹیل ہانولولو میں جنگلی کھوپرے کے سؤر کے گوشت میں سڑا کے تیار کی گئی ہے۔ میں نے منہ کا مزا بدلنے کے لیے زیتون کا میوہ اُٹھا کے منہ میں رکھا۔ اُف! کس قدر تیز تیکھا، ترش، سرکے کی طرح زبان کو کاٹتا ہوا تھا۔

"ارے لونچڑ یہ کاک ٹیل ہے یا تیزاب ہے؟" میں نے جھلا کر کہا۔

مگر لونچڑ بڑے مزے سے چسکیاں لے لے کر کاک ٹیل پی رہا تھا اور باتیں کرتا جا رہا تھا۔ دو تین کاک ٹیل پینے کے بعد اس کی حالت

عجیب ہوگئی اور اس کی آنکھیں ہار روم کی منقش چھت پر گڑ گئیں اور وہ اپنے خیالوں میں کھو گیا۔ "ہائے! مجھے امریکہ کے HOTDOGS یاد آتے ہیں۔"

"گرم کتے کیا ہوتے ہیں؟ عجیب سا نام ہے،" میں نے پوچھا۔

وہ بولا: "امریکہ میں گرم کتے ایک خرح کے کباب کو کہتے ہیں۔"

"اور گرم کتوں کو امریکہ میں کیا کہتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

اس نے مجھے گھور کر دیکھا، پھر نگاہیں پھیر کر چھت پر گاڑ دیں۔

"ہائے! مجھے ہیم برگر ( ) یاد آتے ہیں۔"

"یہ کیا بلا ہے؟" میں پھر پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

لونچر تشریح کرنے لگا۔ دس منٹ کی لمبی تشریح کے بعد معلوم ہوا کہ ہیم برگر میں تلی ہوئی مچھلیاں بیچی جاتی ہیں۔

میں نے جل بھن کے کہا: "سالے تو اس کے لیے امریکہ جانے کی کیا ضرورت ہے، یہاں ہر گھر میں ہیم برگر ہے۔"

وہ بولا: "ہائے وہ بیس بال۔"

"یہ کیا ہوتا ہے؟"

بیس منٹ کی تشریح کے بعد پتا چلا کہ امریکی بیس بال وہی تھے جسے ہم لوگ بچپن میں لکڑ ڈانڈا کے نام سے کھیلتے تھے۔ ہمالیہ کے دامن میں اور امریکہ سے بہت دور اور آج سے ہزاروں سال بہت پہلے سے ہمارے بزرگ کھیلتے آئے ہیں، بیس بال۔ ہنہہ!

اور نیک رنگ پارٹی۔ (

"وہ کیا؟"

لونچڑ کی آنکھیں خوابیدہ ہو گئیں۔ وہ بولا: "نیک اِنگ پارٹی کا پہلا اصول یہ ہے کہ اس پارٹی میں کوئی خاوند اپنی بیوی کے پاس نہیں جائے گا اور بیوی ہمیشہ اس پارٹی میں کسی دوسرے کی آغوش میں بیٹھے گی۔ اوہ بوائے، اوہ بوائے مجھے سن سناٹی کی وہ پارٹی یاد آتی ہے۔"

وہ اپنی یادوں میں کھو گیا:

گرم کتنے، گرم عورتیں، خالی بوتلیں اور خالی دماغ۔

یکایک مجھے متلی سی محسوس ہونے لگی۔

میں نے پوچھا: "تم نے امریکہ میں اور کچھ نہیں دیکھا؟"

وہ بولا: "کیا؟"

"ہاورڈ فاسٹ کو دیکھا؟"

"کون؟"

"پال رابسن کو دیکھا؟"

"والٹ وہٹ مین کی شاعری سنی یا پڑھی تھی؟ بچوں کو سکول جاتے ہوئے دیکھا تھا؟"

جگ موہن نے کہا: "میں سٹیٹس میں ان فضول باتوں کے لیے نہیں گیا تھا۔"

میرا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے لونچڑ کی ٹائی پکڑ لی اور کہا: "تم امریکہ سے یہ ٹائی لائے ہو جس کے ایک طرف مینجوار ہی ہے۔ دوسری

طرف عریاں رقص ہے۔ ایک طرف قمار بازی ہے۔ دوسری طرف عصمت فروشی۔ ایک طرف ٹروومین ہے دوسری طرف ایٹم بم۔ لیکن یہ تمہارا امریکہ ہے دوست، میرا امریکہ ایسی ٹائی نہیں، میرا امریکہ تو ایسی ٹائی ہے جس کے ایک طرف ابراہیم لنکن ہے تو دوسری طرف محنت کرنے والا حبشی ہے۔ جس کے ایک طرف والٹ وہٹ مین ہے تو دوسری طرف امریکی جہازی۔ ایک طرف بچے سے محبت کرنے والا باپ ہے تو دوسری طرف خاوند کی وفادار بیوی اور ایک طرف پیک سکل کی جانبازی ہے تو دوسری طرف امن کی فاختہ۔ میں ایسی ٹائی کو ہمیشہ اپنے گلے میں پہنتا ہوں اور اسے سو بار بوسہ دیتا ہوں۔"

اس نے اپنی ٹائی چھڑاتے ہوئے کہا: "تم ہمیشہ سے ویسے کے ویسے سیاسی بدھو رہے۔" پھر اس نے اپنی نگاہیں میری طرف سے ہٹا کر بار کی چھت میں گڑا دیں اور ملامت بار لہجے میں بولا: "ہائے، اس ویران ملک میں کتنی گھٹن ہے۔ کاش میں پھر واپس امریکہ جا سکتا۔"

"کاش تم جا سکتے!" میں نے دلی خلوص اور نفرت سے کہا۔

"مگر اب کے کون سی ٹریننگ حاصل کروں؟" وہ میری نفرت نہ سمجھ کر بڑی بے صبری سے پوچھنے لگا۔ "وظیفہ تو میں کسی نہ کسی طرح حاصل کر لوں گا۔"

"اب کے تم انسانی کھوپریوں کا نیبل نکالنے کی ٹریننگ حاصل کرنا اس کے لیے تمہیں یہاں سے وظیفہ بھی مل جائے گا اور پھر امریکی صاحب

اقتدار طبقے نے اس کے لیے بڑی آسانیاں بہم پہنچا رکھی ہیں۔"

اتنا کہہ کے میں اس کی میز سے اُٹھا اور باہر چلا گیا۔

لونچر چند لمحے ہکا بکا میری طرف دیکھتا رہا پھر اسے اپنے سامنے ایک پرتگیزی حسینہ نظر آئی جو اپنی سیٹ پر بیٹھی بینڈ کی گت پر تال دیے جاتی تھی۔ اس کی ٹانگیں بڑی خوبصورت تھیں۔

لونچر نے بڑے زور سے کہا: "ہکی۔"

اور اپنی ٹائی کا رخ بدلنے میں مصروف ہو گیا۔

محبت کا پھول

شیام کے مرنے سے دو سال پہلے میری اس کی لڑائی ہوئی تھی۔ یونہی ایک ذرا سی بات پر، اگر کوئی دوسرا ہوتا تو میں لڑتا بھی نہیں۔ مگر شیام میرے اس قدر قریب آچکا تھا کہ مجھے لڑنا پڑا۔ لڑائی کی ابتدا بھی اس کی طرف سے نہیں ہوئی، گو میرے خیال میں وہی اس کی وجہ تھا مگر اس دو سال کے عرصے میں میں نے کبھی اس سے صلح کرنے کی کوشش نہیں کی، اس نے بہتیری بار کی۔ اس نے میرے بھائی سے کہا، میرے بھائی کی بیوی سے کہا، خود مجھے بلانے کی کوشش کی۔ ایک بار وہ ہربنس اپنے چھوٹے بھائی اور اپنے چچا کے ساتھ فلورا فونٹین کے قریب مل گیا مجھے دیکھ کر مسکرا دیا۔ اس کا چھوٹا بھائی اور چچا بھی مجھے دیکھ کر مسکرائے کیونکہ وہ مجھے بڑی اچھی طرح جانتے تھے۔ شیام نے اپنے دونوں بازو پھیلا دیے اور آگے بڑھتے ہوئے، ہنستے ہوئے میرا استقبال کرنا چاہا یکایک میں نے پلٹا کھایا اور گھوم کر تیزی سے مخالف سمت کو مڑ گیا میں نے پیچھے مڑ کر اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔

آخری بار میں نے اسے پدوکن اور چرکوسیوف کے اعزازی جلسے میں دیکھا، جو ان دو مشہور و معروف سوویٹ فلمی فن کاروں کے اعزاز کے اعزاز میں ایکسلسیر سینما میں منعقد کیا گیا تھا جس میں پنڈت جواہر لال نہرو بھی تشریف لائے تھے۔ عباس اور میں ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ اتنے میں شیام کو دیکھ کر عباس نے اسے ادھر ہی بلا لیا۔ میرے قریب ایک سیٹ خالی تھی۔ وہ آیا: لمبا تڑنگا، چھ فٹ کے قریب اونچا، فراخ ماتھا، مضبوط ٹھوڑی، ہونٹوں پر لبشاش مسکراہٹ، آنکھوں میں ذہانت کی لو۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا میرے قریب آیا اور میرے شانے پر ہاتھ رکھ کے بولا: "ہیلو بھاپا۔"

چونکہ میں اس سے عمر میں چھ سال بڑا تھا۔ اس لیے وہ مجھے بھاپا یعنی بڑا بھائی کہا کرتا تھا، حالانکہ مجھ سے بڑی عمر والے بھی آج کل مجھے بھاپا کہتے رہتے مگر اس میں ان کا قصور کیا، بعض آدمیوں کے ماتھے پر ہی بھاپا جی لکھا ہوتا ہے۔

بھاپا جی نے یعنی میں نے اس موقعے پر بھی اس کی گرم جوشی کا استقبال بڑی سرد مہری سے کیا۔ میں نے زیر لب ہی اسے آہستہ سے ہیلو کہا اور پھر سامنے سٹیج پر دیکھنے لگا۔ اس روز وہ ڈھائی گھنٹے میرے ساتھ بیٹھا رہا۔ میں اس سے بات کرنا چاہتا تھا مگر نہ کر سکا۔ وہ بھی بے چین اور دل برداشتہ تھا، خاموش تھا۔ دونوں دوست ساتھ ساتھ رہتے مگر خاموش رہتے۔ یہ عجیب سی دوستی تھی جو قہقہوں سے

شروع ہوئی اور خاموشی میں کھو گئی کیونکہ اس کے بعد میں نے شیام کو کبھی نہیں دیکھا۔ مرنے سے چند روز پہلے اس نے مہندر ناتھ کو بلا بھیجا: مجھے تم سے ضروری کام ہے، مگر مہندر بھی چند مصروفیات کی وجہ سے اس سے ملنے نہ جا سکا۔ وہ کیا ضروری کام تھا۔ کیا وہ ہمارے بگڑے ہوئے تعلقات کے متعلق تھا؟ دل میں ہزاروں طرح کے وسوسے آتے ہیں، ہزاروں خیال آتے ہیں، مگر اب اس کا کوئی مداوا نہیں ہے وہ دیوار پھاند کر دوسری طرف چلا گیا ہے۔ آج میں اسے آواز دیتا ہوں، اسے پھر محبت اور پیار سے اپنے گلے سے لگانا چاہتا ہوں مگر وہ دیوار کے دوسری طرف چلا گیا ہے۔

شیام کو فلمی دنیا میں دلچسپی لینے والے لاکھوں لوگ بطور اک ہیرو کے جانتے ہیں مگر بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ وہ اپنی نجی زندگی میں بھی ایک ہیرو کی طرح رہتا تھا۔ سکرین پر اور سکرین کے باہر بھی اس کی الگ ہی شان تھی۔ ایک اپنی شخصیت تھی جس کا اثر وہ ہمیشہ اپنے سے بہتر اداکاروں اور شخصیتوں پر بھی چھوڑ جاتا تھا۔ کھلا خرچ کرنے، صاف ستھرے اور خوبصورت کپڑے پہننے، اچھا کھانا کھانے، اچھے لوگوں کی صحبت میں بیٹھنے اور زور سے قہقہہ لگانے کی عادتیں اس کی شخصیت کا پرکشش حصہ تھیں۔ اس کی گفتگو میں اس کی فطری ذہانت کو بڑا دخل تھا۔ فلمی دنیا کے ناصاف ماحول میں رہتے ہوئے بھی اس کی شخصیت ایک دھلے ہوئے کپڑے کی طرح چمکتی ہوئی نظر آتی تھی۔

اس کی فلمی دنیا کا آغاز اچھا نہیں تھا۔ شروع شروع میں وہ اچھا ایکٹر بھی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اسے اپنے آپ کو بنانے سنوارنے اور آگے بڑھانے میں بڑی محنت کرنی پڑی۔ وہ فلمی دنیا میں کسی سہارے یا وسیلے کے بغیر آیا تھا۔ وہ جب تک جیا خوشامد اس کی فطرت کا حصّہ نہ تھی۔ شیام خطرناک حد تک صاف گو تھا۔ جو اس کے جی میں آتا صاف صاف منہ پر کہہ دیتا تھا اور اس معاملے میں کسی بڑی سے بڑی شخصیت کا بھی لحاظ نہ کرتا۔ یہ بات نہیں ہے کہ وہ منہ پھٹ یا گستاخ تھا یا وہ اپنے سے بڑوں کا ادب نہ کرتا تھا۔ مگر وہ بے جا خوشامد کا قائل نہ تھا اور نہ اسے سازشوں اور ایک دوسرے کے خلاف چالاکیوں کے جال بننے میں مزا آتا تھا۔ ادب و احترام کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اگر اسے کوئی بات ناپسند ہوتی تو وہ اپنے سے بڑوں کی محفل میں بھی اس کا ذکر کرنے سے گریز نہ کرتا۔ مثال کے طور پر جوش صاحب کا وہ بے حد عقیدت مند اور پرستار تھا لیکن اگر کسی ادبی، علمی یا فلمی معاملے پر ان سے بحث ہو جاتی تو شیام ہر بات پر ہاں سے ہاں ملانے سے انکار کر دیتا اور جس بات کو وہ غلط سمجھتا اس کی تردید بڑے زور سے کرتا۔

ہر جگہ، زندگی کے ہر شعبے میں وہ اس صاف گوئی کا قائل تھا۔ محبت کے میدان میں کم از کم تین بار اسے اپنی اسی صاف گوئی کی وجہ سے بے حد تکلیف اُٹھانا پڑی۔ ہر موقع پر اس نے غم کھا لیا اور اپنی محبت کو ناکارہ ورق کی طرح پھاڑ کر پھینک دیا، مگر اپنی صاف گوئی

کو ترک نہیں کیا۔ اس نے اپنی زخمی محبت کو قہقہوں کی تابناک تہوں میں چھپا لیا تاکہ کسی کو گمان نہ ہو کہ اس ہنسی کے پیچھے کتنے آنسو چھپے ہوئے ہیں، مگر اپنی صاف گوئی کو ترک نہیں کیا۔ صاف گوئی جب اس سے کسی کو تکلیف پہنچے بہت آسان ہوتی ہے، مگر صاف گوئی جب اس سے خود کو تکلیف پہنچے بہت مشکل ہوتی ہے۔ شیام اس میدان کا بھی ہیرو تھا۔

شیام کو دوست بنانے کا فن آتا تھا۔ دراصل وہ جس روز ایک نیا دوست نہ بنالے اسے چین نہ آتا تھا۔ زندگی سے محبت اس کی نس نس میں سمائی ہوئی تھی۔ اسی محبت سے وہ ہمیشہ بے قرار اور بے چین رہا کرتا تھا۔ بھاگنے دوڑنے، ناچنے کودنے، ہاتھ پاؤں ہلانے اور زور زور سے باتیں کرنے کا اسے بے حد شوق تھا اور کچھ نہیں ہوگا تو وہ راہ چلتے ہوئے لوگوں سے باتیں کرنا شروع کر دے گا، باتیں کرتے کرتے ان کے گھر چلا جائے گا۔ دوسرے دن انہیں اپنے گھر بلائے گا اور وہ لوگ بہت جلد اس کے ماں باپ، بہن بھائی چچا دوست، یار اور محبوب ہو جائیں گے۔ شیام کی اپنی چھوٹی سی تیس سالہ زندگی میں بہت سے دوست تھے، بہت سے سگے بھائی تھے، بہت سے چچا تھے، بہت سی موسیاں اور خالائیں تھیں اور بڑی چھوٹی بہنیں اور مائیں تھیں، بہت سی محبوبائیں تھیں۔ وہ ایک بڑے وسیع انداز میں بڑی بھرپور زندگی بسر کرنے کا عادی تھا۔ اس

نے اپنی چھوٹی سی زندگی کو بڑی محنت سے اپنی محبت کی بھوک سے بہت دور تک پھیلا دیا تھا: ملٹری کے جوان اور فرانسیسی سپاہی، انگلو انڈین قحبائیں، جوتشی، قلفی والے، کتھا واچک، کپڑا بیچنے والے، چینی، حمال، ڈاکٹر، ادیب، فلم ساز، ریس کے جاکی، ریلوے کے کلرک بے کار گداگر، ٹھیکے والے، کھلاڑی، دانش ور اور بے وقوف، اس کی دوستی کی ہمہ گیریوں نے دور دور تک اپنا اثر پھیلا رکھا تھا۔ اسی لیے جب آج وہ مر گیا ہے تو دور دور تک اس کی باتوں کی خوشبو باقی ہے۔

میری اور اس کی ملاقات بہت معمولی طریقے سے ہوئی، مگر اس میں بھی اس کی شخصیت کا راز جھلکتا ہے۔ میں جب آل انڈیا ریڈیو چھوڑ کر پونا کی شالیمار پکچرز میں آیا تو جوش اور ساغر وہاں پہلے ہی موجود تھے میں ان کے کمرے میں بیٹھا باتیں کر رہا تھا تو شیام جو اس کمپنی کا ہیرو تھا، چپکے سے اندر داخل ہوا۔ میرے قریب کرسی پر بیٹھ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا کے بولا: "میرا نام شیام ہے، میں آپ کو پہچانتا ہوں۔ میں نے آپ کی فلاں کتاب پڑھی ہے، فلاں نہیں پڑھی، فلاں کہانی مجھے بہت پسند آئی، فلاں پسند نہیں آئی۔ بہرحال! کیا آپ کا آج شام کا سینما اور رات کا کھانا میرے ساتھ ہو سکتا ہے؟" یہ سب کچھ وہ ایک سانس میں کہہ گیا اور اس کے بعد ہنسنے لگا۔ پھر ہم سب ہنسنے لگے۔ بہت جلد اس نے مجھے اپنا بے تکلف دوست بنا لیا۔ پھر تو ہم اکٹھے رہنے لگے۔ دو سال سے زیادہ عرصے

تک ہم لوگ ایک مکان میں اکٹھے رہے حالانکہ شیام بے حد انفرادیت پسند تھا۔ خود پرستی بھی اس میں تھی مگر دوست سے دوستی اور ذہانت سے سمجھنے اور سیکھنے کی خو بھی اس میں تھی۔ چنانچہ جب اس نے دیکھا کہ میں چلنے کا عادی ہوں اور وہ سائیکل پر گھومنا پسند کرتا ہے تو اس نے میرے لئے سائیکل پر چڑھنا چھوڑ دیا۔ جب اس نے دیکھا کہ میں ایک قمیض اور پتلون میں گھومنا پسند کرتا ہوں تو وہ بھی کوٹ اتار کر کھلے کالروں والی قمیض میں گھومنے لگا۔ جب اس نے دیکھا کہ میں رات کو کتابیں پڑھتا ہوں اور وہ روز رات کو سینما دیکھتا ہے تو اس نے ہر روز سینما جانا بند کر دیا۔ اب اکثر یوں ہوتا تھا کہ ادھر میں اپنے کمرے میں بند کوئی کتاب پڑھ رہا ہوں تو وہ بھی اپنے کمرے میں بند ہو کے کتاب پڑھ رہا ہے۔ رفتہ رفتہ اس کا کتابوں کو پڑھنے کا شوق اس کی زندگی کا حصہ بن گیا۔ ترقی پسند ادب چاہے وہ دنیا کے کسی کونے کا کیوں نہ ہو وہ ڈھونڈ کے لاتا تھا اور چاہے کچھ بھی ہو خود کتاب خرید کے پڑھتا تھا اور کبھی دوسرے کو اپنی کتاب پڑھنے کو نہیں دیتا تھا بلکہ ہمیشہ یہ مطالبہ کرتا تھا کہ کتاب خود خرید کے پڑھو ان دنوں اس کی آمدنی بھی زیادہ نہ تھی پھر بھی گھر اپنی ماں کو روپے بھیجنے کے بعد اور مکان کا کرایہ، راشن کا خرچ ادا کرنے کے بعد وہ اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ کتابوں پر صرف کرتا۔ انہی دنوں اسے اردو کے بہترین شاعروں اور ادیبوں سے ملنے کے مواقع ملے اور

اور وہ ذاتی طور پر بھی ان ادیبوں کے بہت قریب ہو گیا اور ان کی تحریک میں اور ان کے مقاصد میں گہری دلچسپی کا اظہار کرنے لگا۔

پونا کی زندگی کی بہت سی باتیں آج یاد آتی ہیں: پرویز کی آمد، پرویز منگنی کا ہیرو، نوکری کی تلاش میں پونا آیا تھا، اور گو شالیمار میں خود شیام ہیرو تھا مگر شیام نے بڑی فراخدلی سے خود اس کی سفارش کی اور کمپنی کے مالک سے کہہ سُن کے اسے اپنی کمپنی میں ایک دوسرا ہیرو رکھوا دیا۔ پھر پرویز بھی ہمارے ساتھ رہنے لگا۔ بعد میں مہندر بھی آگیا۔ پرویز، شیام اور مہندر یہ تینوں وجیہہ لوگ تھے۔ چنانچہ ہمارے گھر اکثر لڑکیوں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ بہت سی لڑکیاں ان میں سے کسی ایک نہ ایک پر مرتی تھیں، اور میں ان سب کو دیکھ کے جیتا تھا۔ بڑی رونق تھی۔ مگر بے ہودگی نہ تھی کیوں کہ پورے گھر کی فضا ادبی تھی، فلمی کم تھی، ادبی زیادہ تھی، اس لیے جوانی کی کوتاہیوں، خامیوں کے باوجود بھی توازن برقرار رہتا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے دن جوش، ساغر، شیام پرویز، مہندر اور میں اور دوسرے مقامی ادب پسند دوست مل بیٹھتے اور ایک چھوٹی موٹی ادبی مجلس منعقد کر لیتے۔ کبھی کبھی بمبئی سے یا یوپی سے یا پنجاب سے دوسرے ادیب آجاتے تو ہفتوں اپنے ہاں رہتے ان سب باتوں نے شیام کی فکری زندگی پر بڑا خوش گوار اثر چھوڑا تھا اور اس کے کردار کو نمایاں طور پر آگے بڑھنے کا موقع دیا تھا۔

مون سون کی بارشوں کے بہت سے دھندلے دھندلے دن یاد

آتے ہیں، جب ہم لوگ سینما سے نکل کر اپنے گھر تک اکثر پیدل چلا کرتے تھے۔ تین چار لڑکے تین چار لڑکیاں، بارش کی ہلکی ہلکی پھوار، چمکتی ہوئی آنکھوں میں بھیگی بھیگی نمی، بھیگی ہوئی سڑک پر بھیگے ہوئے قدموں کی چاپ، گیلے ہاتھوں میں گیلے ہاتھ اور بھیگی ہوئی گرمی کا احساس، اور ایک بارش سے دھلے مصفی جذبے کی مسرت اور وہ گیت جو ہم سب لوگ چلتے چلتے گاتے تھے اور جن میں شیام کی آواز سب سے اونچی اور سب سے بے سری ہوتی تھی۔ میری عینک بار بار پانی کے قطروں سے دھوئی جاتی اور میں بار بار اسے رومال سے صاف کرتا یا کسی ساری کے پلو سے اور "ک" کی زلف رخسار سے چپک کر عجیب سی خوبصورتی پیدا کرتی۔ اور "پ" کے گھنگھریالے بالوں پر پھوار کے قطرے یوں چمکنے لگتے جیسے اس نے باریک موتیوں کا جال اپنے بالوں میں ٹکا رکھا ہے اور "ج" شوخی سے اونچے لانبے شیام کے سر کی طرف نگاہ اٹھا کے کہتی: "اب تو تمہارے سر پر برف جم رہی ہے شیام۔" اور شیام ایک قہقہہ لگا کے اس کا چھوٹا سا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کے کہتا: "لو دیکھ میری ننھی منھی چوچی موچی گڑیا برف ابھی پگھل کے گر جائے گی۔ مگر گرما میٹر میرے ہاتھ میں ہے۔"

اور وہ رات جب میں اپنی والدہ کی علالت کی وجہ سے سخت پریشان تھا۔ شیام نے باتوں باتوں میں اپنی والدہ کا ذکر کیا، جب بالکل بچپن ہی میں اس کی ماں اور باپ دونوں داغ مفارقت دے گئے اس کی

سوتیلی ماں نے اسے پالا پوسا، اسے اپنی شفقت اور محبت دی مگر اس سے شیام کی تسلی نہ ہوئی۔ ہزاروں دوستوں میں گھرے رہنے کے باوجود اس کی پیاسی روح کی تسلی نہ ہوئی۔

اس نے مجھ سے کہا: "مجھے اپنی ماں کی صورت بھی یاد نہیں ہے۔ میں اس کے دودھ کا بھوکا ہوں۔ میری سوتیلی ماں نے مجھے ماں سے بڑھ کر چاہا، پھر بھی میں اسے غیر سمجھتا ہوں۔ بہت سے دوستوں نے مجھے اپنی دوستی اور محبت دی ہے۔ پھر بھی میں محبت کا بھوکا ہوں، ننگا ہوں، پیاسا ہوں، اس دودھ کا نعم البدل مجھے کہیں نہیں ملا۔ شارک سکن میں، نہ شراب میں، نہ محبوب کے بوسے میں۔ میری یہ تشنگی کبھی نہیں بجھی۔ میں اس قدر بھوکا کیوں ہوں؟"

میں نے کہا: "ہم جس وقفے میں پیدا ہوئے وہ دو تہذیبوں کے درمیان کا بحرانی دور ہے۔ ایک تہذیب مر رہی ہے دوسری جنم لے رہی ہے۔ بیچ کا وقفہ بھوک کا وقفہ ہے۔ محبت کی بھوک، روٹی کی بھوک، انسانیت کی بھوک، پیار، آرام اور خدمت کی بھوک۔ یہ تشنگی اس وقفے میں مٹائی نہیں جا سکتی، ہاں اس سے کام لیا جا سکتا ہے۔"

اور شیام جب تک جیا اس نے اس سے مفید سماجی کام لیا۔ اس نے حتی المقدور اپنے سوتیلے بھائی، بہنوں اور ماں کی خدمت کی اور آخری دم تک خدمت کرتا رہا۔ اس نے سماج کے رواج توڑ دیے اور جس مسلمان لڑکی سے محبت کرتا تھا اس سے شادی کی۔ اس نے گذشتہ تین

چار سال میں ترقی پسند ادب تحریک کی ہر ممکن مدد کی۔ ان کی اپیل پر دستخط کیے اور اس کی دوسری بمبئی کنونشن کے لیے چندہ بھی دیا۔ بمبئی میں ہر اچھے مقصد کے لیے وہ اپنی مدد کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتا تھا اور یہ مدد وہ منہ بنا کے سنجیدہ ڈھنگ سے نہیں کرتا تھا بلکہ ہنستے ہوئے مذاق کرتے ہوئے، باتوں باتوں میں اس طرح کر جاتا تھا کہ کسی کو معلوم نہ ہو کہ اسے واقعی زندگی کے بلند مقاصد سے اس قدر پیار ہے۔

"من کی جیت" نے شیام کو فلم کا مشہور ستارہ بنا دیا جس نے اس کی شہرت اور دولت میں ترقی دی۔ اب وہ پہلی صف کا فلمی اداکار بن گیا، مگر اب بھی وہ پہلا شیام ہی رہا: بے باک، نڈر، بے خوف، صاف گو، محبت کا بھوکا۔ اپنی دو سال کی بچی کے بارے میں وہ اپنی بیوی تاجی سے روز کہا کرتا تھا:

"میں اسے فلمی ستارہ نہیں بناؤں گا، اسے میں چھ زبانوں آٹھ زبانوں، دس زبانوں، دنیا کی سب سے بڑی زبانوں کا عالم بناؤں گا۔ لوگ کہتے ہیں کہ بیٹے کو پڑھانا چاہیے، میں سمجھتا ہوں میری یہ بیٹی ہی میرا بیٹا ہے۔ اسے میں پیرس کے تصویر گھروں میں بھیجوں گا، روسی بیلے کی تعلیم دلواؤں گا۔ میری بیٹی دنیا کی بہترین کتابیں پڑھے گی، خود لکھے گی بھی۔ وہ ایک بہت بڑی دانشور ہو گی۔ کیوں تاجی؟"

اور تاجی مسکرا کے کہتی: "ہاں شیام تمہارے خواب ضرور پورے ہوں گے۔"

شیام کہتا: "جو کام میں نہیں کر سکا وہ یہ کرے گی، جس کی بھوک مجھے ہے، اس کی سیرابی میرے بچوں کو میسر ہوگی۔"

"جو دنیا میں نے نہیں دیکھی وہ یہ دیکھے گی۔"

محبت کا بھوکا!

پرسوں محبت کا بھوکا اچانک مر گیا۔ وہ بالکل تندرست اور صحت مند تھا۔ اس کے رخسار گلاب تھے، اس کی ہنسی جوان تھی۔ اس کا قہقہہ بلند تھا۔ اس کے بازوؤں میں قوت اور دل میں زندگی کی محبت تھی۔ صبح سویرے ہی اس نے اپنی ماں کو پونا بھیجا۔ اپنی بہن کو جس کی شادی ہونے والی تھی، اس سے مذاق کرتا رہا، پھر اس نے اپنی بچی کو گود میں اٹھا کر پیار کیا، پھر ناجی کا ہاتھ پکڑ کے کہا: "آج شام کو سینما چلیں گے، میں سٹوڈیو سے ٹھیک چھ بجے واپس آجاؤں گا۔"

اس کے بعد وہ شبستان کی شوٹنگ میں چلا گیا۔

آؤٹ ڈور شوٹنگ پر گھوڑ سواروں کا سین تھا۔ وہ گھوڑے پر چڑھ کر ہنسی مذاق کرتا رہا، اپنے گھوڑے کو تھپتھپاتا رہا، گھوڑے سدھانے والے سے مذاق کرتا رہا، فلم کے سین کے لیے سرپٹ گھوڑا دوڑاتا رہا، یکایک گھوڑا دوڑاتے دوڑاتے اس کی رکاب ٹوٹ گئی۔ اور شیام ایک جھٹکے سے زمین پر آگرا اور گھوڑے کی تیز دولتی سر پر لگی اور اس کی ناک اور منہ سے خون جاری ہو گیا۔ اسی وقت اس بے ہوشی کے عالم میں اسے لبرٹی سینما کے پاس ایک نرسنگ ہوم میں بھیجا گیا۔ ڈاکٹروں نے کہا:

"حادثہ خطرناک ہے، اس سے موت واقع ہو سکتی ہے۔" مگر شام نے ڈاکٹروں کو تسلی دی: "گھبراؤ نہیں، میں لڑنا جانتا ہوں، میں بچ جاؤں گا، کوئی فکر نہ کرو میں ٹھیک ہو جاؤں گا، سب ٹھیک ہو جائے گا، یہ خون شون کا بہنا سب بند ہو جائے گا، سمجھے ڈاکٹر صاحب!"

ڈاکٹر مسکرایا۔

شیام لڑتا رہا۔

شام کے پانچ بجے اس پر جانکنی کی حالت طاری ہو گئی۔

چھ بجے کے قریب جب کہ اسے اپنی بیوی سے سینما جانے کے لیے ملنا تھا۔ چھ بجے کے قریب اسے ذرا سا ہوش آیا تو اس نے آنکھیں کھولیں اور ایک زور کی چیخ ماری اور دم توڑ دیا۔

محبت کا بھوکا مر گیا۔

سونا پوری کے شمشان گھاٹ پر میں نے اسے آخری بار دیکھا اور اس سے کہا: "اُٹھ بے بھوتنی کے سالے! تیرا دوست تجھے بلانے آیا ہے۔ روٹھا ہوا جگری دوست خود تجھے گلے لگانے آیا ہے آپسی رنجشوں اور شکایتوں کو خیرباد کہہ دیں اور ہاتھ میں ہاتھ دیے دھندلی دھندلی بارشوں، ہلکی ہلکی چاندنی میں بھیگی سڑکوں پر آوارہ پھریں۔ اُٹھ او بے سرے گانے والے، بے ہنگم مونٹ ایورسٹ کے چیچا شیام آج تیرے ہونٹوں کی ہلکی سی جنبش پر میں سہگل کی ساری میٹھی دھنوں کو قربان کر دوں گا۔ اُٹھ، میری روٹھی جوانی کے روٹھے دوست آج

تیرے لیے سارے جہان کی محبتوں کے خزانے لایا ہوں۔ میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ ہم اور تم کبھی ایک دوسرے سے روٹھیں گے نہیں بلکہ دونوں مل جل کر دوسرے دوستوں کے ساتھ اس جہان نو کی تخلیق کریں گے جہاں کوئی محبت بھوکی نہیں رہے گی، کوئی نگاہ ترسی نہیں رہے گی، کوئی لے بے سری نہیں رہے گی۔"

مگر آج شیام مجھ سے نہیں بولا۔ وہ آج مجھ سے کنّی کاٹ گیا تھا اور مخالف سمت پر، چپ چاپ خاموش اپنی بھوکی محبت کے زخموں کو چھپا کے چلا گیا۔

دھند اور آگ اور شعلے لپکتے ہوئے....

جو مر جاتے ہیں وہ مر جاتے ہیں، پھر واپس نہیں آتے پھر کبھی نہیں ملتے، پھر کبھی نہیں سنتے، پھر کبھی نہیں ہنستے۔ لیکن جو زندہ ہیں وہ سن سکتے ہیں، وہ تو ہنس سکتے ہیں۔ اس لیے آؤ اپنے سارے روٹھے ہوئے دوستوں کو منالیں۔ گزر جانے والے شیام کی یاد میں زندہ رہنے والے شیاموں کو گلے سے لگالیں۔

آج محبت بھوکی ہے اور ایک دو سال کی بچی رو رہی ہے۔ محبت کی خاطر، بچوں کی خاطر، شیام کی ہنسی کی خاطر۔

زندگی کو آواز دو اور اپنے آنسوؤں کو جھٹک دو کیونکہ شیام نے ہمیں رونا نہیں ہنسنا سکھایا ہے۔

سو روپے

میں نے سو روپوں کا کام کیا تھا۔ مجھے سو روپے ملنے چاہئیں اس لیے میں نے سیٹھ سے بات کی۔

سیٹھ نے کہا: "سولہ تاریخ کو آنا۔"

میں سولہ تاریخ کو گیا۔

سیٹھ وہاں نہیں تھا۔ اس کا بڈھا منیجر جس کی چندیا صاف تھی اور جس کا ایک دانت باہر نکلا ہوا تھا اور جو اپنے اسسٹنٹ کو کسی غلطی پر ڈانٹ رہا تھا، مجھ سے بڑی شفقت سے کہنے لگا: "تم نے سو روپے کا کام کیا ہے، تم کو برابر سو روپے ملیں گے، مگر آج سیٹھ یہاں پر نہیں ہے کل آنا۔"

میں نے پوچھا: "اگر سیٹھ کل بھی یہاں پر نہ ہوا تو؟"

منیجر بولا: "تو میں انتظام کر رکھوں گا، تم فکر نہ کرو تمہارا پیسہ تم کو مل جائے گا۔"

میں نے دفتر سے باہر نکل کر دو پیسے کا پوسٹ کارڈ، سیکلی مسالہ اور ہری

پتی والا پان کھایا۔ دو پیسے میں دیسی کالا کانڈی اور ٹھنڈک والا پان بھی کھا سکتا تھا اور ملٹھی، لال مصالحہ والا پان بھی اور بنارسی چھوٹا پتہ، گیلی ڈلی اور الائچی والا پان یا موہنی تمباکو والا، مگر میں نے صرف پونا پتہ سکیلی مصالحہ اور ہری پتی والا پان ہی کھایا کیوں کہ مجھے بھوک بہت لگ رہی تھی اور میری جیب میں صرف ڈیڑھ دو آنے تھے اور یہ پان جو میں نے کھایا کافی موٹا ہوتا ہے اور دیر تک منہ میں رہتا ہے۔

پھر میں نے ایک آنے کا ٹرام کا ٹکٹ لیا اور ٹرام میں بیٹھ کر میں نے زور سے سیٹھ کی بلڈنگ کی طرف تھوک دیا۔

دوسرے دن پھر سیٹھ وہاں نہیں تھا۔ اس کے مینجر نے کہا:
"سیٹھ آج بھی یہاں نہیں ہیں اور پھر تمہارے حساب میں کچھ غلطی بھی ہے۔"

مجھے غصہ آگیا۔ میں حساب دے چکا تھا۔ مینجر اسے دس بار چیک کر چکا تھا پھر بھی کہیں سے غلطی نکل آتی ہے مگر میں کچھ نہ کہہ سکا کیونکہ مینجر کا لہجہ بہت نرم تھا اور اس کا ہر فقرہ ریشم میں لپٹا ہوا تھا۔ اس لیے میں نے بھی نرمی سے کہا: "میرا حساب تو بہت صاف ہے۔"

اتنا کہہ کے میں نے اپنی خاکی پتلون کی جیب سے ایک میلا پرزہ نکالا اور مینجر کے ساتھ گیارھویں دفعہ تفصیلات چیک کرنے

بیٹھ گیا: اتنے پیسے ریگ مال پھیرنے کے، اتنے پیسے روغن کے، اتنے پیسے مزدوری کے۔ ریگ مال اور روغن کی رسیدیں میرے پاس تھیں۔ مزدوری پہلے سے طے ہو چکی تھی۔ سیٹھ کا فرنیچر میری محنت سے جگ مگ، جگ مگ کر رہا تھا۔

مینجر نے کہا: "ہاں حساب ٹھیک ہے، اچھا کل آنا۔"

"مگر کل ضرور۔" میں نے ذرا زور دے کر کہا۔

"ہاں کل ضرور۔" مینجر نے چندیا کو سہلاتے ہوئے کہا۔

باہر آکر میں نے دو پیسے کا پان بھی نہیں کھایا، ایک آنے کا ٹرام کا ٹکٹ بھی نہیں لیا اور فیروز شاہ مہتا روڈ سے سائین تک پیدل گیا۔

مگر دوسرے دن میں پھر سیٹھ کے دفتر گیا۔

آج دفتر میں سیٹھ موجود نہیں تھا، مینجر بھی غائب تھا۔

مینجر کا اسسٹنٹ چند دھیائی ہوئی آنکھوں سے ایک سنگل چائے اپنے سامنے رکھے کچھ سوچ رہا تھا۔ اس کا چہرہ بہت زرد تھا، ماتھے کے قریب، سفید رخساروں کے قریب پیلا اور ٹھوڑی کے قریب مٹیلا سا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے ان کے چہرے کی ہڈیاں کے اوپر کھال کے بجائے میلے میلے، پیلے پیلے کاغذ تراش کے منڈھ دیے ہوں۔ میں اس کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا۔

اسسٹنٹ نے پیالی سے نگاہ اٹھا کر میری طرف دیکھا اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ میں نے پوچھا: "سیٹھ کہاں

ہیں؟"

وہ بولا: "سیٹھ اپنے دوسرے دفتر میں گیا ہے۔"

"اور مینجر کہاں ہے؟"

"مینجر سیٹھ کے تیسرے دفتر میں گیا ہے۔"

"تو مجھے یہاں چوتھی منزل پر کس لیے بلایا ہے؟" میں نے ذرا غصے میں تیز ہوتے ہوئے کہا۔

اسسٹنٹ نے چائے کا آخری گھونٹ بھی نگل لیا۔ آہستہ سے بولا:

"تم یہاں بیٹھ جاؤ، مینجر ابھی آتا ہوگا۔ اس سے بات کر لینا۔"

میں ایک کرسی پر ساڑھے دس بجے سے لے کر پونے دو بجے تک بیٹھا رہا۔

پہلے میں نے سوچا کہ ایک شیشے کا ٹکڑا لے کر اس سارے روغن کو اُتار دوں جو میں نے اتنی محنت سے اس فرنیچر پر چڑھایا تھا۔ پھر میں نے سوچا کہ اپنے دونوں ہاتھوں سے اسسٹنٹ کے نقلی چہرے سے پیلے پیلے کاغذ کے ٹکڑوں کو اُتارتا جاؤں حتیٰ کہ اندر کی ہڈی ننگی ہو جائے پھر میں نے سوچا: مینجر کو جان سے مار دینا بہتر ہوگا۔ بہت دیر تک سیٹھ کے لیے سزا سوچتا رہا۔ آخر خیال آیا کہ اس کے سارے جسم پہ بی نمبر کی موٹی ریگ مال پھیر دوں گا تو اس کی ساری کھال ادھڑ کر ننگی ہو جائے گی۔ پھر مینجر آ گیا۔

مسکراتے ہوئے بولا: "تمہارا کام ہو گیا ہے، مگر چیک ملا ہے سو روپے

کا۔ اور اب پونے دو بج چکے ہیں اور دو بجے بنک بند ہوتا ہے اور بنک یہاں سے دو میل دور ہے اور کل چھٹی ہے اور پرسوں اتوار ہے۔" میں نے مایوسی سے کہا:۔

"ہاں۔" مینجر مسرت سے ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔

میں نے بے حد لجاجت سے کہا: "چیک مجھے دے دو۔"

پانچ منٹ اور چیک لینے میں گزر گئے کیونکہ چیک پر میرا نام غلط لکھا ہوا تھا۔ محمد شفیع کے بجائے محمد رفیع لکھا ہوا تھا۔

"چچ چچ" مینجر نے کہا، "بڑی غلطی ہو گئی۔ محمد شفیع لکھتے لکھتے محمد رفیع لکھ گیا مگر کوئی حرج نہیں، اب تم سوموار کو آ کے نیا چیک لے لینا۔"

میں نے کہا: "مگر یہ تو بیرر چیک ہے۔ نام کی غلطی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم میرے نام کی رسید لے لو اور مجھے چیک دے دو، سوموار کو میں کہاں آؤں گا کہیں اور دھندا کروں گا۔"

"اچھا تو لے جاؤ۔" مینجر نے رکتے رکتے کہا۔

چیک لے کر باہر آیا تو دو بجنے میں پونے نو منٹ تھے۔ کسی صورت سے پیدل چل کے میں بنک نہیں پہنچ سکتا۔ سو روپے کا چیک میرے ہاتھ میں تھا مگر ابھی کاغذ کا پرزہ تھا۔ اسے سو روپوں میں تبدیل کرنے کے لیے بنک تک پہنچنا ضروری تھا۔ دو بجے سے پہلے صرف ایک صورت ہو سکتی تھی۔

میں نے فیصلہ کر لیا اور چلا کر کہا: "اے ٹیکسی۔"
پیلی چھت اور سیاہ جسم والی ٹیکسی زوم سے میرے قریب آ کر رک گئی۔

میں نے اندر بیٹھتے ہوئے کہا: "کالبا دیوی روڈ کے ناکے پر چلو اور ذرا تیز چلاؤ۔" جب کالبا دیوی روڈ کے ناکے پر پہنچا تو دو بجنے میں دو منٹ تھے مگر بنک کالبا دیوی روڈ پر نہیں تھا۔ گو چیک پر یہی لکھا تھا مگر بنک کالبا دیوی روڈ کے ناکے پر نظر نہ آیا۔ دو ایک دکانداروں سے پوچھا، کسی کو اتنی فرصت نہیں تھی۔ کوریا میں جنگ تیز تھی، بھاؤ بھی تیز جا رہے تھے، کس کو وارنش کرنے والے کے سو روپوں کی فکر تھی۔

ہار کر میں ایک پنجابی سکھ ہارمونیم بنانے والے کی دکان میں گھس گیا۔ "آیئے آیئے کیا باجہ چاہیے آپ کو؟" سردار نے اپنی اس آری کو چھوڑ کر جس سے وہ لکڑی کاٹ رہا تھا مجھ سے مسکرا کر کہا۔

میں نے کہا: "سردار جی مجھے باجہ نہیں چاہیے، مرکنٹائل بنک کا پتا چاہیے۔ چیک پر تو لکھا ہے کالبا دیوی روڈ اور یہاں کہیں ملتا نہیں۔"

سردار جی نے مسکرا کر کہا: "بادشاہو! وہ بنک تو ساتھ والی گلی میں ہے، ادھر گھوم کے سٹہ بازار کے اس طرف، پرانے چاندی والے مندر کے پاس۔" میں نے سردار جی کا شکریہ بھی ادا نہیں کیا بھاگا واپس ٹیکسی کے پاس۔ جب بنک میں پہنچا تو دو بج کر چار منٹ تھے۔ اصولاً میرا

چیک کلرک کو نہیں لینا چاہیے تھا مگر معلوم ہوتا ہے کہ کلرک چیک پڑھنے کے علاوہ چہرہ پڑھنا بھی جانتا تھا۔ اس نے خاموشی سے چیک مجھ سے لے لیا۔ پھر الٹا کر کے دیکھا، مجھ سے کہنے لگا:

اس پر دستخط تو کر دو۔"

میرا نام محمد شفیع تھا لیکن میں نے محمد رفیع لکھا۔ یہ محمد رفیع کون تھا؟ یہاں کہاں سے آیا تھا؟ کب پیدا ہوا؟ اس کی صورت کیسی تھی؟ اس کے ماں باپ کون تھے؟ کون جانتا ہے؟ کچھ زندگیاں ایسی ہوتی ہیں جو چیک پر لکھی جاتی ہیں اور چیک پر ہی کاٹ دی جاتی ہیں۔

میں ٹیکسی والے کا چکتا کرنے لگا۔ دو روپے دو آنے ٹیکسی چھوٹی تھی اس لیے میٹر بڑھا نہیں۔ ٹیکسی بڑی ہوتی تو پانچ سات روپے کھل جاتے۔ میں نے خوشی سے اطمینان کا سانس لیا۔ اتنے میں کسی نے آ کے میرے شانے پر زور سے ہاتھ مارا اور کہا۔ "کہو میرے یار بڑے ٹیکسی میں گھوم رہے ہو آج۔"

میں نے گھوم کر دیکھا: میرا دوست اسحاق تھا۔ اسحاق بڑے کھلے دل کا آدمی تھا۔ وہ خود تو عبدالرحمٰن سٹریٹ کے اندر ایک خوجے کے مکان میں ایک تنگ سے کمرے میں رہتا ہے اور وہی دھندا کرتا ہے جو میں کرتا ہوں یعنی وارنش کا اور پرانے فرنیچر کو پھر سے نیا کر دینے کا لیکن اس کی محبوبہ محمد علی روڈ اور کرافورڈ مارکیٹ کے ناکے پر ایک اچھے ہوٹل میں رہتی ہے۔ میں نے دیکھا ہے بڑی خوبصورت عورت ہے، بڑے بڑے سیٹھوں کے پاس جاتی ہے۔ یہ اسحاق اس سے

پہلے اس کے پاس ڈرائیور تھا۔ اسحاق کو یہ کام پسند نہیں آیا اور وہ اس سے الگ ہو گیا۔

وہ عورت اس کو بہت پسند کرتی ہے۔ یہ بھی اس کو چاہتا ہے مگر وہ اس کو اپنے ڈھرے پر لانا چاہتی ہے اور یہ اس کو اپنے طریقے پر رکھنا چاہتا ہے۔ دونوں میں ہمیشہ لڑائی ہوتی ہے۔ پھر یہ اس سے دس بارہ روز نہیں ملتا۔ پھر وہ اس سے ملنے آتی ہے۔ ایسے ہی یہ چکر چلتا رہتا ہے۔ کبھی کبھی اسحاق جب کوئی موٹی رقم کما لیتا ہے تو اسے جا کے دے آتا ہے اور اسے ایک لیکچر بھی جھاڑ آتا ہے مگر جس عورت کے پاس اچھا ہوٹل ہو گا، اچھی جوانی، صحت اور خوبصورتی ہو گی اور سونے چاندی والے سیٹھ ہوں گے وہ وارلش کرنے والے اسحاق کی بات کیوں سننے لگی۔ سوچنے کی بات ہے یار د!

میں نے اسحاق سے پوچھا: "مجھے بھوک لگی ہے، کچھ کھاؤ گے؟"

وہ بولا: "ہاں بھوکا تو میں بھی ہوں، چلو فیروز کے کبابیے کی دکان پر۔"

فیروز کے کبابیے کی دکان سے فارغ ہو کر اسحاق نے مجھ سے دس روپے اُدھار لیے اور اپنے راستے پر چلا گیا۔ مجھے اسحاق بہت پسند ہے۔ اس کے پاس پیسے ہوں تو نا نہیں کرے گا، سب کو کھلائے پلائے گا اور جب پیسے نہیں ہوں گے تو میرے سوا کسی سے قرض نہیں مانگے گا، بھوکا مر جائے گا مگر کسی سے اُدھار نہیں لے گا۔ ایسا

دوست جو دنیا میں میرے سوا کسی سے اُدھار نہ لے کہاں ملتا ہے
مجھے اسحاق کی دوستی پہ بڑا فخر ہے۔ میں جب بھی اسحاق سے ملتا ہوں،
ایک عجیب سی خوشی، لاپرواہی، بچوں کی سی مسرت محسوس کرتا ہوں
مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے دل میں کوئی غم نہیں ہے، کوئی تکلیف
نہیں ہے۔ جیسے ساری دنیا کھلونوں سے بھری ہوئی ہے اور اس کے
سارے بازار میرے لیے سجے پڑے ہیں۔ بعض آدمیوں میں کچھ ایسی ہی
بات ہوتی ہے۔

اس وقت اسحاق سے مل کر میرا جی ہلکا پھلکا ہو گیا۔ میں نے کرافورڈ
مارکیٹ سے دو سیب خرید کر کھائے، ایک بھکاری کو دو آنے دیئے
وہاں سے چلتا چلتا بوری بندر آ گیا لیکن جیب میں روپے تھے اور
ابھی گھر جانے کو جی نہ چاہتا تھا۔ اس لیے بوری بندر سے ہارن
بی روڈ پر ہو لیا۔

ہارن بی روڈ کی دکانیں مجھے بہت پسند ہیں۔ خاص طور پر ان
دکانوں کے نمائشی دریچے جن میں آئینے لگے ہوئے ہیں اور نئی اُن کی
روشنیاں اور قد آدم کانچ کی بڑی بڑی شفاف سلوں کے پیچھے کیسی
کیسی خوبصورت چیزیں پڑی ہوتی ہیں: خوبصورت ٹائیاں، موزے
جراب، پتلون کے کپڑے، مفلر، جوتے۔ ہر ہفتے ان دریچوں کے اندر
خوبصورت چیزیں بدل جاتی ہیں اور پرانے ڈیزائنوں کے بجائے
نئے ڈیزائن آ جاتے ہیں۔ شام کو گھر جانے سے پہلے میں اکثر ہارن بی

روڈ کے نمائشی دریچے دیکھا کرتا ہوں۔ جیب میں پیسے ہوں یا نہ ہوں اس سے کوئی غرض نہیں لیکن میں اکثر اپنا کام ختم کر کے بوری بندر جانے کے لیے ہارون بی روڈ سے گزرتا ہوں اور ایک دریچے سے ناک رگڑ کر اندر کی خوبصورت چیزیں دیکھا کرتا ہوں۔ اس میں مجھے اتنا لطف حاصل ہوتا ہے جتنا بچپن میں نئے کھلونے دیکھ کر حاصل ہوتا تھا۔

میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر نئے نئے کرارے نوٹوں کو تھپتھپایا اور بڑی شان سے ایوان اینڈ فریزر کے نمائشی دریچوں کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ آہ! کس قدر خوبصورت قمیص تھی۔

بادامی رنگ کی صاف شفاف قمیص پر بلیو اور سرخ رنگ کی دھاریاں میرا تو جی مچل گیا۔ میں نے اپنی قمیص کے پھٹے ہوئے کالر کو سہلایا۔ اس بلیو اور سرخ رنگ کی دھاری دار قمیص کو پہن کر میں کیسا دکھائی دوں گا؟ میں نے تخیل میں اپنے آپ کو یہ قمیص پہن کر ایک بڑے قد آدم آئینے کے سامنے دیکھا۔ واہ! کیا ٹھاٹ تھے اور قمیص کے دام تھے صرف تیس روپے اور اس سے تگنے روپے اس وقت میری جیب میں تھے۔ میں یہ قمیص خرید سکتا تھا مگر کچھ اور بہتر دیکھنے کی خاطر آگے چلا گیا۔

اگلے دریچے میں خوبصورت صابن تھے۔ جھاگ والے، اسپنج اور تولیے جنہیں دیکھ کر خود بخود نہانے کی خواہش پیدا ہوتی تھی۔ یہ سب میں خرید سکتا تھا۔ اس سے اگلے دریچے میں مردوں کے لیے شب خوابی کے گاؤن تھے: بھڑکیلے، ریشمی منقش گاؤن جنہیں پہن کر وارنش والا

بھی مصر کا پاشا معلوم ہو۔ ستر روپے کا گاؤن اور اس سے زیادہ رقم میرے پاس تھی۔ میں نے اس گاؤن کو اپنے تخیل میں پہنا اور ایک ایرانی غالیچے پر اُڑتا ہوا بہت دور چلا گیا۔ ہوا صاف تھی۔ میرے نیچے خوبصورت باغوں والی زمین گھوم رہی تھی اور ہری ہری دوب میں ایک چھوٹی نازک اندام ندی ایک پہاڑی حسینہ کی طرح دھوپ سینک رہی تھی۔

میں نے اس غالیچے کو اس ندی کے کنارے اُترنے کا حکم دیا۔ غالیچہ ندی کے کنارے اُتر آیا اور خود بخود بچھ گیا۔ پھر خود بخود کہیں سے ایک صراحی آگئی اور ایک مرمریں ہاتھ اور دو آنکھیں اور ایک حسین چہرہ پھر مجھے کسی نے ٹھوکا دیا اور کرخت لہجے میں کہا:

"آگے بڑھو، اب کسی اور کو بھی دیکھنے دو، آدھے گھنٹے سے یہیں کھڑا ہے نہ لینا نہ دینا۔" میں نے مسکرا کر ایوان اینڈ فریزر کے وردی پوش غلام کی طرف دیکھا جو مجھے ڈانٹ رہا تھا اور آگے چل دیا۔ بے چارے کو کیا معلوم تھا کہ میرے پاس ایک ہوا میں اُڑنے والا ایرانی غالیچہ ہے اور جیب میں ستر روپے سے بھی زیادہ کی رقم ہے۔ میں اس وقت اندر جا کے اس گاؤن کو خرید سکتا تھا۔ مگر میرا جی نہیں مانا۔ ہارٹن بی روڈ پر اس سے بہتر بھی کوئی چیز ہو گی۔ آگے چل کے دیکھا جائے۔ اس وردی پوش غلام کو تو کسی وقت بھی شکست دی جا سکتی ہے۔

آگے چلتا چلتا بہت سی دکانیں دیکھتا بھالتا میں جگدمبا لال پائل

کی دکان پر پہنچ گیا۔ یہاں نمائشی دریچے میں کیمرے پڑے تھے جنہیں میں خرید سکتا تھا۔ کیمرے خرید کے میں ان تمام فریچروں کی تصویر لے سکتا تھا جو پرانے تھے لیکن جنہیں میرا وارنش اور میری محنت اتنا خوبصورت بنا دیتی تھی کہ وہ بالکل نئے فریچر کی طرح جگمگانے لگتے تھے۔ میں نے سوچا یہ کیمرہ لے کر میں اسحاق کے پاس جاؤں گا اور اس سے کہوں گا:

"چل، آج تیری اور تیری محبوبہ کی اکٹھی تصویر لیں گے۔" میں نے اپنا ایرانی غالیچہ منگوایا اور کیمرہ ہاتھ میں لے کر سارے جہان کے خوبصورت مناظر کی تصویریں اُتارنے لگا۔

کیمرے کے ساتھ جادو بین پڑی تھی جس میں دیکھنے سے تصویریں بالکل اپنی مکمل گہرائی کے ساتھ نظر آتی ہیں یعنی جیسے آدمی بالکل آپ کے سامنے چل پھر رہے ہوں اور مکان آپ کے سامنے ہو بہو جیسے آپ کا گھر۔ تصویر اپنی لمبائی، چوڑائی اور موٹائی کے ساتھ اتنی اچھی دکھائی دیتی ہے کہ سینما میں بھی اتنی اچھی معلوم نہیں ہوتیں۔ بچپن میں ایک بڑھیا ایک بڑی سی جادو بین ہمارے محلے میں لایا کرتی تھی اور ہم لوگ ایک پیسہ دے کر تماشہ دیکھتے تھے۔ اس جادو بین کو دیکھ کے میرا دل خوشی سے کانپنے لگا اور میں دکان کے اندر داخل ہو گیا۔

کونٹر پر میں نے ایک نوجوان سے پوچھا: "یہ جادو بین کتنے کی ہے؟"

"ساڑھے سینتیس روپے کی۔"

نوجوان بڑی خوبصورت قمیص پہنے تھا۔ اس کے بال گھنگھریالے اور پیچھے گھومے ہوئے تھے آن کی روشنی میں نئے فرنیچر کے وارنش کی طرح چمکتے تھے۔ اس کے ہونٹوں پر بھی جوانی کی وارنش تھی۔ اس کے لبوں پر ایک مغرور مسکراہٹ تھی جو صرف چیک لکھتے وقت پیدا ہوتی ہے۔ اس نے میری طرف نگاہ اٹھا کر ایک خوبصورت لڑکی کی طرف دیکھا جو ابھی ابھی دکان میں میرے بعد داخل ہوئی تھی۔ وہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا اور ایک میلے میلے چہرے والا نا آسودہ گجراتی جو غالباً اس کا اسسٹنٹ تھا، میری طرف آگیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے کا وارنش جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا ہے اور اس نے مسکرانے کی بھی کوشش نہیں کی۔

میں نے کہا: "یہ جادو بین مجھے دکھاؤ۔"

اس نے جادو بین میں ایک مدوّر فلیتہ رکھ کے میرے ہاتھ تھما دیا اور مجھ سے کہا: "اسے گھماتے جاؤ، یوں سوچ دبا کر، نئی نئی تصویریں تمہارے سامنے آتی جائیں گی۔" میں نے بٹن دبا دیا: ٹارزن ہاتھی پر سوار سامنے سے چلا آ رہا تھا۔

میں نے بٹن دبا دیا:

ٹارزن آبشار میں چھلانگ لگا رہا تھا، نیچے مگرمچھ کتنے خوفناک معلوم ہو رہے تھے۔

میں نے بٹن دبایا۔

پھولوں کے گجرے، پھولوں کے ہار اور پھولوں کے لہنگے پہنے ہوئے

ہوائی جہاز کی لڑکیاں ناچ رہی تھیں۔

میں نے بٹن دبایا:

ساحل کی ریت پر شراب اور پھل اور بسکٹ اور کھانے کی چیزیں ایک شفاف طشتری میں پڑی تھیں اور ایک عورت ریت پر آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی۔ اس کا منہ میرے اس قدر قریب تھا کہ میں نے جلدی سے بٹن دبا دیا۔

ایرانی غالیچہ زمین پر آ گیا۔

میں نے گجراتی خارش زدہ کلرک سے کہا: "یہ جادو بین تو بہت اچھی ہے، میرے بچپن کی جادو بین سے ہزار درجے بہتر ہے، کتنے میں دو گے؟"

وہ مسکرائے بغیر بولا: "ساڑھے سینتیس روپے کی جادو بین آتی ہے یہ مدور رنگین تصویروں والے فیتلے ایک درجن اس کے ساتھ لینا پڑیں گے دس روپے کے یہ ہوں گے، اسپلز بکس اس کے علاوہ، پچاس کے اوپر رقم جائے گی۔

میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دس دس کے نئے کرکرے نوٹوں کو تھپتھپایا۔ آپ کو یقین نہیں آئے گا لیکن یہ بالکل سچ ہے کہ اس سے پہلے میرے دل میں جادو بین کے سوائے اور کوئی تصویر نہ تھی۔ لیکن نوٹوں کو ہاتھ لگانے سے ایک دم مجھے دھچکا سا لگا اور بہت سی تصویریں بٹن دبائے بغیر ہی میرے سامنے گھوم گئیں۔

ایک بچہ پھٹی ہوئی قمیض پہنے گلی کے فرش پر بیٹھا ہے اور رو رہا ہے۔ میں نے پہچانا میرا بچہ تھا۔ ایک عورت کی شلوار کا پائنچہ دوسرے پائنچے سے اونچا ہے، اس کی اوڑھنی سے اس کے سر کے الجھے ہوئے بال باہر نکلے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ....

ایک آدمی دروازے میں کھڑا ہے۔

اس کی صورت ہر لمحہ بدلتی جاتی ہے۔ اس کا غصہ ہر لمحہ بڑھتا جاتا ہے۔

کبھی یہ مالک مکان کا مینجر بن جاتا ہے؛

کبھی دودھ والے سیٹھ کا نوکر؛

کبھی بجلی والی کمپنی کا عہدہ دار؛

کبھی پانی والے دفتر کا۔

میں نے بٹن دبا دیا:

اب میرے سامنے گھر کے فرش پر ایک خالی طشتری پڑی تھی جس پر ایک گلاس اوندھا پڑا ہوا ہے۔

نوٹ میری جیب سے باہر نکلے، پھر وہیں ہاتھ میں رہ گئے۔

خوبصورت کلرک، خوبصورت لڑکی کو کیمرہ بیچ کر کونٹر پر واپس آ گیا۔ میں جلدی سے گھوم کر دکان سے واپس جانے لگا۔ باہر جاتے جاتے میں جانتا تھا کہ وہ کلرک اپنی بہترین دارنش شدہ مسکراہٹ سے میرے پھٹے ہوئے کالر دیکھ رہا ہے میری خاکی زین کی پتلون دیکھ رہا ہے،

جس کی پیٹھ پر دو جگہ ٹکڑے سلے ہوتے ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ مجھ پر ہنس رہا ہے۔

میں نے اچھی طرح سے دانت پیس لیے، اچھی طرح سے جیبوں میں ہاتھ ڈال کر نوٹوں کو اپنی گرفت میں لے لیا اور نمائشی دریچوں سے نگاہ اُٹھا کر سیدھا بوری بندر کی طرف چلنے لگا۔

چلتے چلتے مجھے محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے مجھ سے شدید دھوکا کیا ہے کسی نے مجھے سو روپے دے کر دو سو روپے چھین لیے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی میرا ایرانی غالیچہ اور جاد وبین بھی چھین لی ہے۔ کسی نے زور سے میرے منہ پر چپت ماری ہے۔ کسی نے میرے ہر نوٹ پر لکھا یا ہے: "تمہارے لیے نہیں۔"

میرے قدم ہر لحظہ بھاری ہوتے گئے اور میں نے محسوس کیا کہ میری محنت کا ہر نوٹ اُداسی کی ایک لمبی زنجیر ہے، جسے میں خود اپنے ہاتھوں سے کھینچ رہا ہوں۔

بوری بندر پہنچ کر یکایک میں نے فیصلہ کیا کہ میں آج گاڑی سے اپنے گھر واپس نہیں جا سکتا۔ آج میں پیدل ہی بوری بندر سے سانتا جاؤں گا۔

بہت رات گئے میں تھکا ماندہ اپنے گھر لوٹا۔ میری بیوی متفکر تھی اور میرا انتظار کر رہی تھی لیکن جب اس نے نوٹ دیکھے تو خوش ہو گئی۔ اس لیے وہ میری اداسی کا مطلب نہ سمجھ سکی۔

بولی: "لیکن یہ کیا بات ہے، تم آج خوش ہونے کے بجائے اُداس ہو؟"

میں نے چارپائی پہ بیٹھتے ہوئے کہا: "جان من! آج مجھے پتا چلا ہے کہ یہ دنیا بہت بوڑھی ہو چکی ہے اور مجھے ایسی دنیا چاہیے جو بچوں کی طرح مسکرا سکے۔"

وہ بولی: "میں نہیں سمجھی، تم کیا کہہ رہے ہو۔"

میں نے کہا: "جان من! میں کہہ رہا ہوں کہ اب پرانے فرنیچر پہ وارنش کرنے سے کام نہیں چلے گا۔ اب نیا فرنیچر لانا ہوگا۔"

برہم پُترا

نو مار جورے باتی نو مار گھورسے شاتھی

تمہارے ہاں چراغ جلتا ہے اور گھر میں ساتھی بھی ہے۔

امار نورے راتی امار نورسے تارا

میرے لیے رات ہے اور تارے

نو مار اچھے ڈانگا امار اچھے جول

تمہارے لیے زمین ہے اور میرے لیے پانی

نو مار بوشے تھاکا امار چولا چول

تمہارے لیے آرام ہے میرے لیے ہمیشہ کا چلنا

(ٹیگور کا ایک گیت)

اپنے جوڑے میں سفید گلاب کا پھول ٹکائے اور ایک گہرے بسنتی رنگ کی ساری پہنے جس کا لہریہ گہرا سرخ تھا، ٹونیکا سین اپنے منے کی طرف مسکراتی چلی آرہی تھی۔ منا لکڑی کے گھوڑے پر سوار تھا اور وہ اسے چابک مار مار کے اپنی دانست میں سرپٹ دوڑا رہا تھا۔ جب منے نے اپنی ماں کو اپنی طرف

آتے دیکھا تو اس نے لکڑی کے گھوڑے کی باگ زور سے کھینچی اور گھوڑا اُلٹ گیا اور منا نیچے اور گھوڑا اس کے اُوپر جا گرا۔

منا رونے لگا۔ لوتیکا نے ہنستے ہنستے اسے اپنی گود میں اٹھا لیا۔ منا روتے روتے بولا: "گھوڑا بڑا شیطان ہے، اس نے مجھے نیچے گرا دیا۔"

لوتیکا بولی: "تو نے بے چارے کی باگ جو زور سے کھینچ دی تھی"

منا بولا: "میں نے ماں کو دیکھا تھا نا؟"

لوتیکا نے اسے چوم کر اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ بولی: "اچھا دیکھ میں بازار جا رہی ہوں، منے کے لیے کیا لاؤں؟"

منا بولا: "میں تو باجہ لوں گا، گھوڑے پر چڑھ کر باجہ بجاؤں گا اور اپنی فوج کے آگے آگے چلوں گا۔"

یہ کہتے کہتے منے کا چہرہ اس وقت بڑا سنجیدہ ہو گیا۔ بالوں کی لٹیں اس کے ماتھے پر بکھر گئی تھیں۔ وہ رونا بھول گیا تھا۔ آنسو ابھی تک اس کے گالوں پر چمک رہے تھے۔ لوتیکا نے رومال سے اس کے آنسو پونچھ دیے اور اس کی لٹوں میں اُنگلیاں پھیر کر اُنہیں پیچھے جھٹکا دیا۔

"لوتیکا تو کدھر جا رہی ہے؟"

یہ چاچی کی آواز تھی۔ چاچی ہاتھ پونچھتی ہوئی رسوئی سے باہر نکل رہی تھیں۔ چاچی کی عمر بہت بڑی تھی، ان کے سر کے بال سفید تھے، چہرے

پر جھریاں تھیں، جسم سوکھا سوکھا اور پتلا تھا۔ ان کا چہرہ بہت سے غموں اور دکھوں کی کہانی کہتا تھا لیکن اس پر بھی چاچی کے چہرے پر ایک عجیب موہنی معصومیت تھی جو جانے اس بڑھاپے میں بھی جب آدمی سب کچھ کھو بیٹھتا ہے، کیسے باقی رہ گئی تھی۔ آج کل تو بچوں کے چہروں پر بھی ایسی معصومیت نہیں ملتی۔ چاچی نے کیسے اور کس جتن سے اس معصومیت کی حفاظت کی ہوگی، اس کا راز نہیں کھلتا۔ چاچی کی عمر ساٹھ اور آٹھ سال کی تھی۔ اس عمر میں چاچی نے اپنے گاؤں کو جو برہم پتر کے کنارے آباد تھا، دو دفعہ بستے دیکھا، دو دفعہ پھر بستے دیکھا سات دفعہ چھوٹے چھوٹے کال آئے اور تین بڑے بڑے کال اور آخری کال میں تو چاچی کا سارا پریوار ختم ہو گیا اور چاچی اپنا گاؤں چھوڑ کر لوتیکا کے ہاں کلکتے چلی آئیں۔ رائے بہادر موجمدار لین میں لوتیکا کا گھر تھا۔ چاچی جب پہلی بار کلکتے آئیں تو انہیں یہ گھر بھی بڑی مشکل کے بعد ملا۔ اور جب وہ گھر کے اندر داخل ہوئیں تو اس وقت سامنے کے مندر میں آرتی اتاری جا رہی تھی لیکن لوتیکا کے گھر میں آرتی کے وقت بھی اندھیرا تھا اور لوتیکا کانپتی سیڑھیوں پر سے دبے پاؤں اتر کر باہر جا رہا تھا۔ وہ چاچی کے لئے صرف ایک منٹ کے لیے رکا اور پھر یہ کہہ کر فوراً چلا گیا: "چاچی میں پھر آؤں گا، اس وقت میں رک نہیں سکتا، ایک ضروری کام ہے۔ لوتیکا میری غیر حاضری میں تمہارا سب خیال رکھے گی۔" اور پھر چاچی نے دیکھا کہ

لوتیکا کے پتی نے ایک لمحے کے لیے لوتیکا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور پھر اسے چھوڑ دیا اور تاریک سیڑھیوں سے نیچے اتر کر عقب کے دروازے سے باہر جانے لگا۔ پچھواڑے کی گلی میں چاچی نے دیکھا کہ لوتیکا نے بڑی احتیاط سے اس کے لیے دروازہ کھولا، روشنی کی ایک پتلی سی لکیر نمودار ہوئی اندر آئی اور پھر دروازہ بند ہو گیا۔ لیکن اس ایک لمحے میں چاچی نے دیکھا کہ لوتیکا ایک لانبے قد کی، سانولی صورت والی دلکش لڑکی ہے۔ اس نے سفید ساڑھی پہن رکھی ہے اور اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے ہیں۔ ان آنسوؤں کو دیکھ کر چاچی ایک لمحے کے لیے لرز گئی تھی۔ لوگ دھان، کپاس اور گندم بوتے ہیں، چاچی نے تو اپنی زندگی میں صرف آنسو بوئے تھے۔ انہوں نے سوچا تھا کہ شاید یہاں کلکتے میں یہ آنسو نہیں ہوں گے۔ یہ آنسو تو صرف برہم پتر اندی کے کنارے ہوتے ہیں جہاں کسان چاول کے موتیوں کی فصل بوتے ہیں اور آنسو کاٹتے ہیں۔ کیا یہ سنسار ہی ایسا دکھ بھرا ہے؟ ایک لمحے کے لیے چاچی جس آرام اور سکھ کی تلاش میں کلکتے آئی تھیں، اسے بھول گئیں۔ انہوں نے دھیرے سے لوتیکا کا ہاتھ پکڑ کے بڑے نرم لہجے میں پوچھا تھا:

"کیا بات ہے بہو؟"

لوتیکا مسکرا کر اپنے آنسوؤں کو پی گئی۔ اس نے چاچی کا ہاتھ زور سے دبا کر بڑی مدھم آواز میں کہا: "کچھ نہیں چاچی۔ آؤ، اوپر آ جاؤ۔"

لوتیکا نے چاچی کا بقچہ سنبھال لیا تھا اور اسے اُوپر لے گئی تھی۔
اس دن سے آج تک چاچی نے لوتیکا کے پتی کو پھر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ چاچی اپنا گاؤں چھوڑ کر اس لیے یہاں آئی تھیں کہ یہاں برہم پترا نہیں ہے۔ اب انہیں احساس ہوا جیسے برہم پترا یہاں بھی ہے اور جب تک لوتیکا کا پتی یہ دریا پار نہ کرلے وہ واپس گھر نہیں آسکتا۔ بس اتنا ہی انہیں اندازہ ہوسکا۔ وہ اکثر بالکونی میں کھڑے کھڑے گیلے کپڑے ٹانگتے ہوئے سوچا کرتیں۔ اور ان کی آنکھوں کی کانپتی ہوئی حیران پتلیاں نیچے گلی میں بھاگتی ہوئی مخلوق کو دیکھ کر آزردہ ہوجاتیں۔ یہ سب لوگ کس طوفان کی پیشوائی کو بھاگے جارہے ہیں۔ ابھی پانی کہاں چڑھا ہے؟ کہاں یہ آگ لگی ہے؟
لیکن چاچی ان سوالوں کا جواب ٹھیک سے نہ دے سکتیں اور اپنی کانپتی ہوئی پتلیوں سے نیچے گلی میں گزرنے والی مخلوق کو حیرانی سے دیکھتی رہتیں۔

اس وقت چاچی کی نگاہوں میں وہی موہوم سا ڈر تھا جب انہوں نے لوتیکا کے قریب آکر پوچھا: "تو کہاں جارہی ہے لوتیکا؟"
اور پھر لوتیکا کو چپ دیکھ کر چاچی نے خود ہی لرزتی ہوئی آواز میں پھر پوچھ لیا: "کیا جلسے میں جارہی ہے؟"
لوتیکا کی مسکراہٹ بڑی اچھی تھی لیکن چاچی کی مسکراہٹ ایسی تھی

جیسے کوئی مرنے سے چند لمحے قبل زندگی کے سارے دکھ اور درد کو سمجھ لے اور سمجھ کر نیلے آسمان کی طرف دیکھ کر مسکرا دے۔ چاچی کی مسکراہٹ میں شفق کی موہنی تھی لیکن لوتیکا کی مسکراہٹ صبح کا پہلا اُجالا تھی جو بہت دور سے اور شاید کہیں بہت نزدیک سے آئی تھی۔ اور ستاروں کی چلمن اٹھا کر آہستہ آہستہ تاریکی کا نقاب اُلٹ رہی تھی۔ بڑی میٹھی میٹھی، مدھم مسکراہٹ جیسے کوئی ریشم کے اوپر ریشم رکھ دے لیکن یہ مسکراہٹ ایک عجیب رفاقت اور مضبوطی کا احساس لیے ہوئے تھی جیسے برہم پترا بھی ہے اور طوفان بھی ہے، لیکن ایک کشتی بھی ہے جو پار لے جا سکتی ہے۔

چاچی کے ہونٹ کانپے، ایک سفید لٹ گھبرا کے مرجھائے ہوئے رخسار پہ گر پڑی۔ انھوں نے ایک عجیب ملتجیانہ انداز میں لوتیکا سے کہا: "تم جلسے میں ضرور جاؤ گی؟"

لوتیکا ہنسی۔ اس نے وہ سفید لٹ بڑی محبت سے اٹھا کر چاچی کے کان کے پیچھے گھما دی اور بڑے پیار سے بولی: "میں تو آٹھ بجے سے پہلے گھر پہنچ جاؤں گی چاچی۔ آتے ہی مجھے کھانا دے دینا۔ سچ مجھے بہت بھوک لگ رہی ہو گی۔"

لوتیکا جلدی سے یہ کہہ کر تاریک سیڑھیوں سے اُترنے لگی، چاچی سیڑھیوں کے اُوپر منے کا ماتھا پکڑے دیر تک کھڑی رہیں۔ پھر دروازہ

کھلا، روشنی کی ایک پتلی سی لکیر تڑپی، پھر اندھیرا چھا گیا منے نے کہا:
"چاچی چلو مجھے مہاکوی کے ننھے چاند کے گیت سناؤ۔"
چاچی اب سب کچھ بھول گئیں۔ انہیں مہاکوی ٹیگور کے ننھے چاند کے گیت بہت پسند تھے۔ آج انھوں نے منے کو وہ گیت سنایا جب بچہ کھو جاتا ہے اور ماں اسے ڈھونڈتی ہے، اور اس کا نام لے کر پکارتی ہے، اور بچہ ایک جوہی کا پھول بن کر اس کی آغوش میں آ گرتا ہے۔
گیت گاتے گاتے چاچی کو یاد آیا، کتنے خوبصورت جوہی کے پھول تھے۔ ایک ایک کر کے وہ سب برہم پتر اکی لہروں میں کھو گئے اور آخر میں چاچی کی گود خالی رہ گئی، سب کچھ مٹ گیا۔ موتیوں ایسے بیٹے اور موتیوں ایسے دھان کی فصلیں۔ آخر میں صرف برہم پتر اندی رہی اور زمیندار کی گڑھی.... چاچی گیت گاتے گاتے چپ ہو گئیں اور انہوں نے منے کو اُٹھا کر زور سے اپنی باہنوں میں بھینچ لیا۔
منے نے مچلتے ہوئے کہا: "اوں ہوں! چاچی ایک گیت اور سناؤ۔"
اور اب کے چاچی نے وہ گیت سنایا جس میں چاند کی کشتی آسمان کی ندی میں ہولے ہولے بہتی ہے اور بچہ اس میں بیٹھا ہوا اسے ہولے ہولے کھیتا جاتا ہے۔
اور منا یہ کشتی کھیتے کھیتے سو گیا۔

رائے بہادر موجمدار لین سے گزر کر لوتیکا اب گھنشام داس بازار میں چل رہی تھی۔ چلتے چلتے لوتیکا کو دو ایک بار ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی اس کے پیچھے پیچھے چل رہا ہے۔ اس نے گھوم کر دیکھا کوئی نہیں تھا۔ شاید اس کے دل کا واہمہ تھا۔ کوئی اس کا پیچھا نہیں کر رہا تھا پھر بھی احتیاط ضروری ہے۔ لوتیکا نے سوچا شہر میں دفعہ ۱۴۴ لگ چکی ہے سنبھل کے چلنا چاہیے۔ لوتیکا نے چاروں طرف دیکھا: بازار میں لوگ آجا رہے تھے، دکانیں سجی ہوئی تھیں، لوگ سودا سلف بھی خرید رہے تھے، بسیں اور ٹرامیں بھی گزر رہی تھیں پھر بھی لوتیکا کو ایسا محسوس ہوا جیسے یہ سارا امن و سکون سطحی ہے، جیسے یہ فضا اک پتلے باریک فولادی بلیڈ کی سطح کی طرح تنی ہوئی ہے۔ ذرا سا ہاتھ لگانے سے خون بہہ نکلے گا۔ لوگ باگ چل رہے تھے، کام کر رہے تھے، بوجھ اُٹھا رہے تھے اور کہیں کہیں ہنسی کی آواز بھی سنائی دیتی تھی۔ پھر بھی لوتیکا کو ایسے جان پڑتا کہ جیسے اس کے سارے پس منظر میں غصے کی ایک گونج ہے۔ جیسے کہیں دور اُفق پر لال لال روشنی نظر آکے گم ہو جاتی ہے۔ جیسے ریت کے کنارے دھیرے دھیرے لہریں آگے بڑھ رہی ہوں اور لوتیکا چوکنی ہو کر آگے پیچھے دیکھنے لگتی۔

کھلونوں کی ایک دکان پر کھڑے ہو کر اس نے منے کے لیے باجہ خریدا اور اسے اپنے ہونٹوں سے لگا کر بجایا۔ دکاندار نے مسکرا کر

کہا: "آپ تو یہ بہت اچھا بجا لیتی ہیں۔" لوتیکا نے ہنس کر باجہ اپنے بٹوے میں رکھ لیا اور دکان دار کو دام دینے لگی۔ عین اسی وقت اس نے پھر محسوس کیا جیسے کوئی اس کے بہت قریب سے گزر کر نکل گیا ہو۔ اس نے گھوم کر دیکھا کوئی نہیں تھا۔ سامنے دو آدمی گاندھی ٹوپی پہنے مزے میں باتیں کرتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ پھر بھی لوتیکا محتاط ہو گئی۔ جلسے میں جانے سے پہلے وہ آج اپنے پتی سے ملنا چاہتی تھی جو یہیں کلکتے میں چھپا ہوا تھا۔ مگر اب اس نے ایک دم فیصلہ کیا کہ آج وہ اس سے نہیں ملے گی شاید پولیس پیچھا کر رہی ہو اور کہیں وہ اپنی بے وقوفی سے اپنے پتی کی رہائش کا پتا پولیس کو دے دے۔ لوتیکا کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے دکان سے اتر کر چور نگاہ سے اُدھر دیکھا جدھر اس کا پتی چھپا ہوا تھا۔ پھر اس نے منہ موڑ لیا اور بوڈو بازار کی بس پکڑ لی۔ فاصلہ یہاں سے زیادہ نہیں تھا اور وہ پیدل ہی جانا چاہتی تھی مگر اس نے سوچا کہ راستے میں کہیں اس کا دل ڈانوا ڈول نہ ہو جائے۔ اس نے بس پکڑنے ہی میں خیریت سمجھی۔

بس میں اسے نیلما اور پربھا مل گئیں۔ نیلما بڑی نازک مزاج، نفاست پسند لڑکی تھی۔ وہ بہت امیر نہیں تھی، بہت خوبصورت نہیں تھی، بہت پڑھی لکھی نہیں تھی پھر بھی اسے دیکھ کر لوگ ہمیشہ اندازہ لگاتے کہ نیلما بہت خوبصورت ہے، بہت امیر ہے، بہت پڑھی لکھی ہے۔ دراصل اس

کے مزاج میں سلیقے اور سگھڑاپے کو اتنا دخل تھا کہ وہ اپنے چھوٹے سے گھر میں، اپنی چھوٹی سی تنخواہ میں، اپنے چھوٹے سے علم میں اس طرح زندگی بسر کرتی تھی کہ زندگی اپریل کے ابر کی طرح صاف، شفاف اور چمکتی ہوئی نظر آتی۔ نیلما کو اچھی خوشبوؤں کا بڑا شوق تھا کیونکہ ہسپتال میں اسے اکثر گندی سڑی بدبوؤں سے واسطہ رہتا تھا اور نرس کا کام کرتے کرتے اسے ان بدبوؤں سے چڑ سی بھی ہو گئی تھی۔ اس لیے وہ اکثر شام کو چھٹی کے بعد بڑی تیز خوشبو استعمال کرتی تھی۔ لیکن جب سے اس کا اشتراکی خاوند اپنی انقلابی سرگرمیوں کی وجہ سے جیل میں چلا گیا تھا۔ نیلما کو خوشبوؤں سے نفرت سی ہو گئی تھی۔ وہ اب بھی اسی طرح صاف ستھری، نفاست پسند لڑکی نظر آتی تھی۔ اب بھی اس کا گھر آئینے کی طرح چمکتا تھا لیکن اب اس کے بالوں میں خوشبو نہیں تھی اسی لیے تو آج لوتیکا اس کے بالوں کی خوشبو سونگھ کر بہت حیران ہوئی۔

لوتیکا نے پوچھا: "کیوں، کیا ماجرا ہے؟ پتی مہاشے سے ملنے جا رہی ہو؟"

نیلما مسکرائی: "نہیں پگلی، میں تو تیرے ساتھ جلسے میں جا رہی ہوں۔"

اور پربتھا نے اپنے گول گول گال خود ہی تھپتھپاتے ہوئے کہا:

"رام رام! آج تو جیسے خوشبوؤں کا طوفان اُمڈ رہا ہے۔ چاروں طرف چنبیلی ہی چنبیلی ہے اور لوتیکا نے بھی تو آج غضب ڈھا رکھا ہے بسنت

گھٹائیں باندھ کے آئی ہے اور لال لال گلال چاروں طرف بکھر رہا ہے۔ سکھیو! کیا یہ سب جلسے میں جانے کی تیاری ہے؟ وہاں یہ سندرتا کسے دکھاؤ گی؟"

اتنا کہہ کر پربتھا زور سے ہنس پڑی۔ یہ پربتھا کی خاص عادت تھی کہ خود ہی بات کر کے خود ہی ہنس پڑتی تھی۔ پربتھا موٹی موٹی گلگلی سی لڑکی تھی۔ اس کا اکلوتا بیٹا بھی اپنی ماں کی طرح موٹا موٹا، گتھلا گتھلا، بھرا پُرا خوش مزاج نظر آتا تھا لیکن پتی مہاشے بڑے تنک مزاج اور گمبھیر تھے۔ پربتھا اور اس کے پتی کی صفات ان کے لڑکے میں جمع ہو گئی تھیں۔ یعنی لڑکا ماں کی طرح موٹا تازہ اور باپ کی طرح گمبھیر! ذرا سی انگلی دکھانے پر زور زور سے چلانے لگتا۔ پربتھا آج اپنے پتی اور اپنے بیٹے دونوں کو گھر میں چھوڑ کر آئی تھی۔ وہ اب اپنی سہیلیوں سے ہنس ہنس کر کہہ رہی تھی: "آج گھر میں خوب لطف رہے گا۔ یہ دونوں حضرت باری باری سے روئیں گے اور ایک دوسرے کے اوپر برتن پھینک کر اپنا جی بہلائیں گے!"

لوتیکا نے فہمائش کرتے ہوئے اُس سے کہا: "اس طرح اپنے گھر کو رکھو گی تو کیسے کام چلے گا؟"

پربتھا بولی: "تو کیا کروں سکھی، مجھ سے تو ایک ہی بار دو دو کام نہیں ہوتے۔ آج صبح جلسے کے لیے تقریر تیار کر رہی تھی کہ مہاشے چائے مانگنے لگے۔ چائے دی تو کھانا مانگنے لگے۔ کھانا کھلایا تو ٹائی مانگنے

لگے۔ کھوٹی ہوئی ٹائی ڈھونڈھ کے دی تو اتنے میں لڑکے نے کتنے کے منہ میں انگلی دے کر ملہار راگ شروع کر دیا۔ میں نے کتے کو دھر کے پیٹا تو پتی جھاشئے لے نشام کلیان شروع کر دیا۔ اب جب وہاں سے چلی تو دونوں بھیرویں گا رہے تھے۔ اب تم ہی بتاؤ کیا کروں؟"

نیلما نے کہا: "بچے کو کسی اچھے سے ڈاکٹر کو دکھاؤ۔"

پرنبھا نے چمک کر کہا: "کیسے دکھاؤں؟ کلکتے میں اچھا ڈاکٹر جتنی فیس لیتا ہے اس سے تو ہمارے گھر بھر کا مہینے کا راشن چلتا ہے تو کیا بی۔سی۔ رائے کو بلا کے دکھلاؤں؟ تم بھی کیا لوئر مڈل کلاس سماج کے لوگوں کی سی باتیں کرتی ہو۔ کبھی کبھی اور پھر یہ تو دیکھو کہ میں کھلاتی کیا ہوں، اپنے بیٹے کو اور ان کو۔"

اتنا کہہ کر پرنبھا زور سے ہنسی اور پھر بولی: "آج ایک حکیم نے بتلایا ہے کہ انہیں مچھلی میں شلجم پکا کے کھلاؤ تو موٹے ہو جائیں گے۔ آج ہی بازار سے شلجم خرید کے لائی ہوں، یہ دیکھو۔"

پرنبھا نے اپنے پلو میں بندھے ہوئے شلجم دکھائے اور نیلما اور لوتیکا بے اختیار مسکرا دیں۔ سچ مچ پرنبھا بڑی بھولی لڑکی تھی۔ اس پر غصہ آنا بڑا مشکل تھا۔ نیلما نے بڑی محبت سے پرنبھا کے کندھے پر اپنا نازک ہاتھ رکھ دیا اور لوتیکا نے بھی بڑے پیار سے پرنبھا کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ لوتیکا بھی پرنبھا کو بہت چاہتی تھی کیوں کہ پرنبھا مہیلا سنگھ میں بہت اچھا کام کر رہی تھی اور تقریر کرنے

ہیں تو کوئی لڑکی اس سے بازی نہیں لے جا سکتی تھی اور پھر وہ کتنی خوش مزاج لڑکی تھی، کتنی انتھک کام کرنے والی، کہو تو صبح سے شام تک ایک جگہ کھڑی رہے، کہو تو صبح سے شام تک چلتی رہے۔ دھن کی پکی اور غرور تو اسے چھو تک نہیں گیا تھا۔ نہ ہی وہ اپنی ساتھی لڑکیوں سے کسی بات میں جلتی تھی۔ کیسے ہی مشکل سے مشکل کام اسے دیے گئے، اس نے ہنس کر پورے کر دیے۔ پربتھا کی یہ ہنسی اس کے دل سے پھوٹتی تھی اور فوارے کے پانی کی طرح چاروں طرف فضا میں پھیل جاتی تھی لونیکا یوں مسکراتی تھی جیسے چاند بدلی میں جھلملائے پربتھا یوں جیسے سمندر کی بہتی ہوئی لہر سارے ساحل پر پھیل جائے

لونیکا نے آہستہ سے پوچھا: "آج تو جلسے میں کیا کہے گی؟"

پربتھا نے بڑی خود اعتمادی سے اپنی گول گول آنکھیں گھماتے ہوئے کہا: "دیدی دیکھتی جاؤ، آج تمہارے گلے سڑے سماج کے کے بھس میں وہ چنگاری لگاؤں گی کہ سارا کلکتہ جل اٹھے گا بس تم اپنی یہ خوبصورت ساری بچا لینا۔"

پربتھا نے یہ کہہ کے زور سے ہنس کر لونیکا کی پشت پر ہاتھ مارا اور ناز، انداز نیلما اس کی اس حرکت پر اپنی نازک پتلی سی ناک سکیڑ کر اپنی ناخوشی کا اظہار کر رہی تھی کہ اتنے میں بس بوڑ بازار کے نکڑ پر آ کے رک گئی اور یہاں یہ تینوں سہیلیاں اتر کر انڈین ایسوسی ایشن ہال کی جانب چل دیں اتنے میں دوسری طرف سے ایک اور

بس آکے رکی اور اس میں سے ایک بڑی ہی خوبصورت لڑکی نکلی جس کا سجا ہوا جوڑا، ریشمی ساری کا زرنگار لہریہ اور جھم جھماتا ہوا بلاؤز دیکھ کے پرنتھا چلا اُٹھی: "اری اُمیا... اُمیا... او میری جان اُمیا! آج تو نے کیا غضب ڈھایا ہے۔ دو بچوں کی ماں ہو کے پھر سے نئی نویلی دلہن کی طرح سجی ہے!"

اُمیا گھوش مسکراتے ہوئے آگے بڑھی۔ سامنے سے ایک موٹر آرہی تھی اس لیے رک گئی۔ پھر موٹر گزر جانے کے بعد اس نے بڑی ادا سے اپنی زرنگار ساری سنبھالی اور سرسراتی ہوئی گویا ہوا کی لہروں پر اڑتی ہوئی، ٹھمکتی ہوئی وہ سڑک پار کر کے پرنتھا، لوتیکا اور نیلما سے آن ملی۔ اُمیا گھوش بھی مہلا سنگھ کی کارکن تھی اور اس کا پتی سول سیکرٹریٹ میں نوکر تھا۔ اس لیے وہ ہمیشہ اپنی بیوی کو مہلا سنگھ میں کام کرنے سے مزدور عورتوں سے ملنے جلنے اور اشتراکیوں کے جلسے میں جانے سے روکتا تھا اور اُمیا گھوش ہنس کر اور کبھی لڑ جھگڑ کر ٹال دیتی تھی۔ پھر ایک روز مسٹر گھوش بولے: "سرکار میرے دونوں بچوں کو نوکری نہیں دے گی۔ اگر تو نہیں مانے گی تو ایک دن میری نوکری بھی اسی طرح چھن جائے گی۔" اور جب اس پر بھی اُمیا گھوش نہیں مانی تو اتنے خفا ہوئے، اتنے خفا ہوئے...

لوتیکا نے جب یہ سُنا تو اس کا چہرہ غصے سے تمتما اُٹھا۔ بولی: "اور تُو نے کچھ نہیں کہا! چپکے سے پٹتی رہی؟"

اُمیا گھوش بولی: "میں نے کیا کہا، یہ تو جانے دے اس وقت۔ یہ تو روز روز کی بک بک، جھک جھک ہے، ہوتی ہی رہتی ہے۔ وہ کہتے ہیں، میں سنتی ہوں۔"

نیلما نے اُمیا گھوش کی صراحی دار گردن پر ایک لمبی خراش کا نشان دیکھا اور غصے میں بولی: "خبگی! دیکھو تو کتنے زور کا ناخن مارا ہے!"

اُمیا نے مسکرا کر کہا: "نہیں، ناخن تو اتنے زور کا نہیں پڑا، وہ ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی پہنے تھے۔ اسی سے یہ جگہ چھل گئی۔"

پربھا نے پوچھا: "پھر تو آج کیسے آگئی؟"

اُمیا گھوش نے کہا: "دیکھتی نہیں ہو کسی کی شادی میں شریک ہونے کے لیے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ دو روز ہوئے میں نے گھر پہ ایک فرضی سہیلی کی شادی کا دعوتی رقعہ منگوا لیا تھا۔ اب کیا پتی دیو سہیلی کی شادی میں شامل ہونے سے بھی روکیں گے؟"

پربھا اور اُمیا ایک دوسرے کے بازو میں بازو ڈال کر زور زور سے ہنسنے لگیں۔

انڈین ایسوسی ایشن ہال عورتوں سے بھرا پڑا تھا۔ دیواروں پر بڑے بڑے بینر لگے ہوئے تھے، جن پر لکھا تھا:

"سیکورٹی ایکٹ کے قیدیوں کو رہا کرو یا ان پر مقدمہ چلاؤ۔"

"ہڑتالیوں کی مانگیں پوری کرو۔"

"سیاسی قیدیوں کے ساتھ انسانوں کا سلوک کرو۔"
"سیاسی نظر بندوں کو رہا کرو۔"
"بی۔ سی رائے کا بنگال ٹیگور کا بنگال نہیں ہے۔"
"ہم مزدور کسان راج چاہتے ہیں، پولیس راج نہیں چاہتے۔"
اُمیا گھوش بولی: "ایک بینر یہ بھی چاہیے: 'پولیس راج اور رام میں کیا فرق ہے'؛ ٹھیک جواب دینے والے کو نوبل پرائز دیا جائے گا۔"

یہ بات سن کر آس پاس کی بہت سی عورتیں ہنس پڑیں۔ لوتیکا نے نظر دوڑا کے چاروں طرف دیکھا۔ آج کامگار عورتیں خاص طور پر اس جلسے میں زیادہ آئی تھیں۔ سارا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ لوتیکا نے گھڑی دیکھی۔ جلسے کی کارروائی اب تک شروع ہو جانی چاہیے تھی۔ لوتیکا اور پرتبھا کو آتے دیکھ کر اسٹیج پر سے ایک لانبے قد والی بوڑھی مگر پروقار عورت اُٹھی اور بے آواز قدموں سے چلتے ہوئے لوتیکا کے پاس آ گئی اور سخت لہجے میں کہنے لگی: "بہت دیر کر دی!"

لوتیکا معافی مانگنے لگی۔

بوڑھی عورت نے کہا: "ہم لوگ تو گھر بھی نہیں گئے۔ مل بند ہوتے ہی سیدھے ادھر آ گئے۔ تمہیں کون سا مل میں جانا تھا؟"

لوتیکا اور پرتبھا نے پھر معافی چاہی: "رضیہ بہن معاف کر دو نا۔"

رضیہ مسکراتی، بولی: "چلو اب جلدی سے شروع کر دو ہمیں تمہارا ہی انتظار تھا۔"

رضیہ صدر چنی گئی۔ لونیکا نے اشنزا کی نظر بندوں کی مانگوں کو پورا کرنے کا ریزولیوشن پیش کیا اور بڑے نپے تلے الفاظ میں ایک چھوٹی سی تقریر کی۔ اس کے بعد پربھا گھوش نے تجویز کی حمایت کرتے ہوئے آدھے گھنٹے تک جوشیلی تقریر کی اور یہ ستاؤ تالیوں کی گونج میں پاس کیا گیا۔

سب عورتیں کھڑی ہو کر تالیاں بجا رہی تھیں اور نعرے لگا رہی تھیں کہ اتنے میں کسی عورت نے رضیہ کے لیے کاغذ کا ایک پرزہ بھیجا۔ رضیہ نے اس عورت کو اسی وقت اسٹیج پر بلوا لیا۔ یہ ایک زرد رو دبلی پتلی عورت تھی جس کے گال اندر پچک گئے تھے، چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور بال اُلجھ اُلجھ کر ہوا میں اُڑے جا رہے تھے۔ وہ جلدی جلدی اپنے کالے دوپٹے کا پلو سنبھالتی بھاگتی ہوئی آئی اور دھم سے سٹیج پر آ کے کہنے لگی: "بہنو! آپ نے یہ پاس کر دیا یہ تو بڑی اچھی بات کی، پر میں آپ کو ایک بات بتانے یہاں آئی ہوں۔"

وہ یکایک چپ ہو گئی۔ ہال میں باتیں بند ہو گئیں۔ سب اس عورت کی طرف دیکھنے لگے۔

وہ بولی، اور اب اس کے لہجے میں گھبراہٹ نہیں تھی:

"میرا خاوند ایک کارگر ہے وہ جوتے کے کارخانے میں کام کرتا ہے۔ وہ کئی سالوں سے سرخ ساتھی ہے، کئی ہڑتالوں میں اس نے حصہ لیا، کانگریسیوں کے ساتھ جیل بھی گیا۔ خیر جیل جانا اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے، جیسے بھوکے رہنا ہم غریبوں کے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے۔"

وہ چپ ہو گئی۔ لوتیکا کو ایسے محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کا دل پکڑ لیا ہو۔ سارے ہال میں سناٹا تھا!

وہ عورت پھر بولی: "لیکن پہلے اپنے نیتا لوگ سرمایہ دار کے خلاف ہڑتال کرنے کو برا نہیں سمجھتے تھے، میں پوچھتی ہوں وہ اب اسے برا کیوں سمجھتے ہیں؟ کچھ لوگ آج کل کہتے ہیں کہ سرمایہ دار بھی آخر ہمارے بھائی ہیں۔ میں کہتی ہوں تو کیا وہ پہلے ہمارے بھائی نہیں تھے، اب کیا ہوا؟"

مجمع میں سے ایک عورت بول اٹھی: "اب وہ تمہارے بھائی نہیں ہیں اب وہ داماد ہیں داماد!"

اس پر سارا ہال ہنسنے لگا اور تالیاں بجنے لگیں۔ رضیہ نے مشکل سے چپ کرایا۔ وہ عورت بڑے غصے میں آ کے کہنے لگی:

"بھائی ہوں یا داماد، وہ پہلے بھی کارخانہ دار تھے، ہم پہلے بھی مزدور تھے۔ آج بھی وہ کارخانہ دار ہیں، ہم آج بھی مزدور ہیں۔

میرا خاوند پہلے بھی ہڑتال کراتا تھا، وہ آج بھی کراتے گا۔ اسے آج یہ حق کیوں نہیں ملتا ہے؟ آج اسے جیل میں کیوں ٹھونس دیا گیا ہے؟ اور پھر اس پر کوئی مقدمہ بھی نہیں چلایا جاتا۔ انگریزوں کے وقت میں اسے دو تین بار سزا ہوتی تھی مگر ہر بار اسے عدالت نے سزا دی تھی۔ کچھ موٹوں نے جھوٹے سچے بیان دیے تھے، وکیلوں میں بحث ہوتی تھی۔ اب کیا ہے؟ نہ وکیل ہیں، نہ گواہ ہیں، نہ مقدمہ ہے، نہ دفعہ ہے نہ قانون ہے، صرف جیل کی سلاخیں ہیں۔"

وہ عورت ایک لمحے کے بعد پھر بولی: "پچھلے سات دن سے ہمارے گھر راشن نہیں تھا کیونکہ گھر میں اب کوئی کمانے والا نہیں ہے مجھے دو مہینے سے بار بار بخار آتا تھا اس لیے مل والوں نے مجھے نکال دیا۔ گھر میں جو کچھ تھا وہ تھوڑا تھوڑا کر کے ہم نے بیچ دیا۔ پھر میرے پاس تھا ہی کیا؟ کل رات کو میرا بیٹا بھوک سے بلک بلک کر مر گیا۔ گھر میں کچھ نہیں تھا، کئی دن سے نہیں تھا۔ میں ابھی اپنے بچے کو دفن کر کے آ رہی ہوں۔ سیدھی یہیں آ رہی ہوں تاکہ اپنا کالا دوپٹہ بہنوں کے سامنے پھیلا کے ان سے پوچھ لوں کیا یہ پرستاؤ کافی ہے؟ کیا بس یہی تجویز کافی ہے؟ اگر سچ مچ یہ پرستاؤ کافی ہے تو اس کی ایک نقل مجھے دے دی جائے تاکہ میں اسے اپنے ننھے بیٹے کی قبر پر لگا دوں!"

ہال کا سناٹا ایک دم ٹوٹ گیا۔ جیسے کسی نے بند توڑ دیا ہو۔ بہت

سی آوازیں ایک دم گونجنے لگیں:

"نہیں نہیں، یہ کافی نہیں ہے۔ ہرگز ہرگز یہ کافی نہیں ہے۔"

بہت سی عورتیں کھڑی ہو کر چلا رہی تھیں۔ اتنے میں ایک نوجوان کامگار عورت جس نے لہنگا پہن رکھا تھا اور جس کی چھاتیاں غصے کے مارے اِک بپھری ہوئی ناگن کی طرح حرکت کر رہی تھی، دھم سے سٹیج پر کود گئی اور بانہیں پھیلا کے بولنے لگی: "کافی نہیں ہے تو پھر اُٹھو، آگے بڑھو۔ کلکتے کی شیرنیو! کیا تم اپنے بھائیوں، خاوندوں کو جیل میں بھوکا مرجانے دو گی۔ اُٹھو! ابھی جلوس نکال کے چلو جیل کی طرف۔ آج ہم ان کی مانگیں پوری کرا کے واپس آئیں گی۔"

"ہاں ہاں، یہ ٹھیک ہے۔" بہت سی عورتیں اک ہلہ کرنے لگیں، تالیاں بجنے لگیں۔ جلوس نکالنے کی تجویز سب کو پسند آئی۔ چاروں طرف شور اور ہنگامہ بپا ہو گیا۔ رضیہ کو بڑا غصہ آیا۔ اس نے زور سے دو تین بار میز پہ ہاتھ مار کے عورتوں کو خاموش کیا۔

ایک عورت بولی: "کامریڈ پریذیڈنٹ۔"

رضیہ بولی: "تمہاری ایسی تیسی، چپ رہو، ورنہ اُٹھا کے ہال سے باہر پھینک دوں گی۔"

دوسری بولی: "مجھے بھی بولنے کا حق ہے۔"

رضیہ بولی: "تم کون ہو جی، مہلا سنگھ کی ممبر ہو۔"

"نہیں نہیں، میں ممبر نہیں ہوں۔" وہ عورت بول رہی تھی اور

لوتیکا نے دیکھا کہ وہ بھورے رنگ کی بڑی قیمتی، ریشمی ساڑھی پہنے ہوئے ہے۔ ادھیڑ عمر کی موٹی تازی عورت ماتھے پر قم قم سجا رہا تھا، بانہوں میں سونے کی چوڑیاں تھیں۔ اسی عورت نے بڑے تیکھے لہجے میں کہا: "میں ممبر تو نہیں ہوں مگر عام جلسے میں بولنے کا حق مجھے بھی ہے اور خاص طور پر اس لیے بھی مجھے اجازت دی جائے کیونکہ میں آپ کی تجویز کی مخالفت کرنا چاہتی ہوں۔"

رضیہ نے اُٹھ کے کہا: "ایک بھلا اس پرستاؤ کی مخالفت کرنا چاہتی ہیں۔"

"ہو، ہو۔" پھر اک دم شور مچا۔ دوسرے لمحے میں سارا مجمع اس عورت کی طرف متوجہ ہو گیا جو گردن بڑھائے اسٹیج کی طرف چلی آ رہی تھی۔

"کیسی مکار لومڑی کی طرح چلتی ہے۔" ایک عورت زیرِ لب بولی۔

دوسری نے کہا: "کیسی چکنی چیڑی نظر آتی ہے۔"

"خاموش، خاموش۔" رضیہ نے گرج کر کہا۔ اور وہ دونوں عورتیں سہم گئیں اور گردن جھکا کر زمین کی طرف دیکھنے لگیں۔

وہ فربہ اندام عورت اسٹیج پر آ کر کہنے لگی: "بہنو، مجھے سیاسی قیدیوں اور اشتراکی نظر بندوں کی مانگوں سے پوری پوری ہمدردی ہے۔ (تالیاں) میں اس پرستاؤ کی پوری پوری تائید کرتی ہوں۔ جو اس

سلسلے میں آپ نے منظور کیا ہے۔ زنالیاں) میں چاہتی ہوں کہ کلکتے کی ہر عورت آج اپنے گھر میں اس پرستاؤ پر بحث کرے لیکن میں اس جلوس کی تجویز کی مخالفت کرتی ہوں کیونکہ آپ کو معلوم نہیں کہ آج کلکتے میں دفعہ ۱۴۴ لگی ہوئی ہے، قانون توڑ کر ہم قانون کی زد سے بچ نہیں سکتے۔"

"کون بچنا چاہتا ہے؟" ایک آواز ہال کے بالکل پیچھے سے آئی۔

وہ عورت بولی: "دیکھئے ہم عورتیں ہیں، ہمیں اپنے گھروں کو دیکھنا ہے، اپنے بچوں، اپنے رشتہ داروں کو، اپنے شوہروں کو دیکھنا۔۔۔"

نیلما غصے سے کانپنے لگی۔ وہ اُٹھ کے بولی: "میرا شوہر جیل میں بھوکا مر رہا ہے۔"

ایک کامگار عورت بول اُٹھی: "یہ سونے کی چوڑیاں اُتار کے بات کرو۔"

دوسری نے پوچھا: "بلیک مارکیٹ کا سونا ہے کیا؟"

تیسری بولی: "اسے بہن اس کا پتی ضرور گاندھی ٹوپی پہنتا ہوگا۔"

اس پر بہت سے قہقہے بلند ہوئے اور کالی بھجنگ بڑے بڑے مضبوط ہاتھ پاؤں والی عورت اُٹھ کر کہنے لگی: "میں آپ بہنوں سے کہتی ہوں کہ میں اس عورت کے پتی مہاشے کو جانتی ہوں۔

وہ گاندھی ٹوپی نہیں، ہیٹ پہنتا ہے ہیٹ۔"

"تم کیسے جانتی ہو؟" ایک لڑکی بولی۔

اس کالی عورت نے اپنے دونوں بازو اپنے کولہوں پر رکھ لیے اور آتش ریز ہو کر بولی: "اس کا خاوند ہمارے محلے میں رہتا ہے وہ پولیس سب انسپکٹر ہے، ابھی پچھلے منگل کو اس نے میرے بیٹے کو لال جھنڈے والا سمجھ کر اندر دھر لیا۔"

"ہائیں!" پربتھا چلائی، "یہ پولیس انسپکٹر کی بیوی ہے اور یہاں سی۔ آئی۔ ڈی کا کام کرنے آئی ہے۔ نکل یہاں سے۔" پربتھا نے انسپکٹر کی بیوی کو گردن سے پکڑ لیا۔

منورما نے طنزاً کہا: "جانے دے بہن، اس بے چاری کو تو سیاسی نظربندوں سے پوری پوری ہمدردی ہے۔ یہ تو بس جلوس نکالنے کی مخالفت کرتی ہے۔"

"اے ہٹے! کیا ہمدردی جتائی ہے کمبخت نے!" ایک بوڑھی عورت بولی جس کے سر کے بال آدھے سے زیادہ سفید ہو چکے تھے اور جس کا سر ہمیشہ آہستہ آہستہ ہلتا رہتا تھا۔ لوتیکا کو اس کے لب و لہجہ سے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ شمالی ہند کی رہنے والی ہے۔

اتنے میں مجمع کی بہت سی عورتیں پولیس انسپکٹر کی بیوی کے گرد جمع ہو گئیں اور قیاس غالب تھا کہ اس کی ٹھکائی بھی ہو جاتی لیکن اس وقت رضیہ نے بڑی عقل مندی سے کام لے کر سب کو ٹھنڈا کیا

اور بیچ بچاؤ کر کے اس عورت کو جلسے سے باہر نکالا۔ جب وہ عورت جلسے سے باہر نکالی جا رہی تھی تو بے حد گھبرائی ہوئی تھی۔ اس پریشانی کے عالم میں اس کی ساڑی سے ایک پستول بھی نیچے گر پڑا۔

"اوں ہوں۔" اُمیا گھوش نے پستول اُٹھا کے کہا:

"کمبخت پورا انتظام کر کے آئی تھی نظر بندوں کی حمایت میں۔"

اُمیا گھوش اپنے بٹوے میں پستول اس طرح رکھنے لگی جیسے وہ لپ سٹک ہو کہ لوتیکا نے پستول اس سے چھین کر جاسوس عورت کی طرف پھینک دیا اور بولی: "یہ بھی لیتی جاؤ ورنہ پھر کل کلاں کو اپنے اخباروں میں مشہور کرائے گی کہ سیاسی نظر بندوں کی حمائتیوں کی تلاشی پر پستول برآمد ہوئے۔"

جب لوتیکا اور اُمیا گھوش انسپکٹر کی بیوی کو جلسے سے نکال کر دور تک پہنچا کے آئیں تو انہوں نے دیکھا کہ بہت سی عورتیں اپنی ساڑیوں کے پلو کس کر باندھ رہی ہیں۔ کچھ عورتیں بینر اٹھا رہی ہیں رضیہ کے ہاتھ میں جھنڈا تھا۔ ایک جھنڈا اس کالی بھجنگ عورت کے ہاتھ میں تھا جس نے پولیس انسپکٹر کی بیوی کو پہچانا تھا۔ کچھ عورتیں ہال کے کونے میں پڑے ہوئے مٹکے کے پانی سے اپنے پلو بھگو رہی تھیں۔

بنلما بولی: "یہ کس لیے؟"

رضیہ نے کہا: "جب آنسو لانے والی گیس چلے گی تو یہ بھیگا ہوا پلو آنکھوں پر رکھ لینے سے تکلیف کم ہوتی ہے اور آنکھوں کی جلن بہت

کم ہو جاتی ہے۔"

پرتبھا نے پوچھا: "اور اگر گیس نہ چلی، گولی چلی تو؟"

اُمیا گھوش بولی: "گولی نہیں چلے گی۔ اگر گولی چلے گی۔ تو میں آگے ہو جاؤں گی اور میرے گھنے بالوں کے پولیس والے ضرور یہ سمجھیں گے کہ میں جلوس میں نہیں جا رہی، منورما کے بیاہ کی بارات میں جا رہی ہوں۔ کیوں منورما؟"

"ہٹ پگلی!" منورما نے کہا۔

نیلما کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔ بولی: "گولی چل تو سکتی ہے۔"

اُمیا بھی سنجیدہ ہو کے کہنے لگی: "نہیں چل سکتی، یہ ٹیگو کا بنگال ہے۔ یہاں استریوں پہ گولی چلانے کی کس میں ہمت ہے۔"

لوتیکا بولی: "نیلما سکھی تو کیا کھڑے کھڑے سوچ رہی ہے؟"

نیلما بولی: "شاید لوتیکا یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔"

لوتیکا بولی: "پگلی ہوئی ہے؟ میں تو اتنی آسانی سے مرنے والی نہیں ہوں۔"

شمالی ہند کی رہنے والی بوڑھی عورت دروازے پر کھڑی ہو گئی، جہاں سے عورتیں باہر گزر رہی تھیں اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی ڈبیا تھی جس میں سیندور بھرا تھا۔ رستہ روک کے کہنے لگی۔ اس کا سر آہستہ آہستہ ہل رہا تھا: "میری بیٹیو! آؤ میں تمہارے سیندور کا ٹیکہ لگا دوں، یہ ہماری جیت کا سرخ نشان ہے۔ آج

تمہاری جیت ہو گی بیٹیو!"

لوتیکا نے سر جھکا دیا، دوسرے لمحے سرخ ٹیکہ اس کے ماتھے پر چمک رہا تھا۔

جبینوں پر سرخ ٹیکے چمکنے لگے، ہوا میں لال جھنڈے کھلتے گئے یکایک پربتھا نے انٹرنیشنل شروع کیا۔

انٹرنیشنل گاتی ہوئی عورتیں انڈین ایسوسی ایشن حال سے نکل کے جلوس کی صورت میں بوبو بازار میں آگئیں اور چار چار کی قطار باندھ کے کالج سٹریٹ کی طرف بڑھنے لگیں۔ آگے آگے رضیہ تھی اور وہ کالی بھجنگ عورت ان کے پیچھے۔ لوتیکا، نیلما، پربتھا، منورما، گیتا سرکار اور اُمیا گھوش ان کے پیچھے آ رہی تھیں۔ لوتیکا نے ایک نگاہ پیچھے ڈال کے دیکھا: جلوس بڑی باقاعدگی اور ترتیب سے آگے بڑھ رہا تھا اور اس کے انقلابی نعرے گونج رہے تھے۔ لوتیکا نے دیکھا کہ بازار کی عام فضا میں جیسے بجلی سنسنا گئی ہو۔ کچھ لوگوں میں ہراس پھیل گیا اور وہ اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ بہت سے لوگوں نے عورتوں کی ہمت کی داد دینی شروع کی، جنھوں نے اپنی جان پر کھیل کر دفعہ ۱۴۴ کے ہوتے ہوئے جلوس نکال کر بھوک ہڑتالیوں سے اپنی ہمدردی ظاہر کی۔ بہت سے امیر دکان دار اپنی دکانیں بند کرنے لگے۔ کچھ راہ گیر سڑک چھوڑ کر تنگ گلیوں میں گھستے گئے، کچھ جلوس کے ساتھ

آتے گئے۔ بوڈ بازار کے اونچے بالا خانوں میں چند عورتیں میک اپ کیے ہنس رہی تھیں۔ ایک ٹرام بجلی کا تار رگڑتی ہوئی آگے نکل گئی لوتیکا چلتے چلتے دیر تک اس بجلی کے تار کو دیکھتی رہی۔ یکایک چوراہے پر اس تار سے ایک شعلہ پیدا ہوا اور وہ کانپ گئی۔ فضا اس وقت بالکل نقلی سی معلوم ہو رہی تھی۔ قدم آگے بڑھ رہے تھے۔ زبان پر گیت کے جوشیلے مصرعے تھے۔ لیکن ان مصرعوں کے اندر اور باہر جیسے انہیں کاٹتے ہوتے ان کے آگے پیچھے جھانکتے ہوئے کئی خیال آتے جاتے ایک دوسرے سے ٹکرا کر گڈمڈ ہوتے جا رہے تھے۔ چاچی کے چہرے پر ایک بھورے رنگ کا مسا کتنا اچھا معلوم ہوتا ہے۔۔۔ میں آج اپنے پتی سے کیوں نہیں ملی۔۔۔۔ ٹرام کا تار کیسے بھاگتا جا رہا ہے۔۔۔۔ نیلما کی ناک۔۔۔۔ میں آج اپنے پتی سے مل آتی تو اچھا ہوتا۔۔۔۔ گولی چل سکتی ہے۔۔۔۔ نہیں چل سکتی، نہیں چل سکتی۔۔۔۔ وہ جیپ آ رہی ہے! اور لوتیکا کے خیال جیپ سے چپک گئے۔ اب اس کے ذہن میں کچھ نہیں تھا۔ سامنے سے جیپ آ رہی تھی۔ جیپ کے اوپر لاسلکی کا آلہ لگا ہوا تھا اور جیپ میں پولیس بیٹھی ہوئی تھی اور جلوس آگے بڑھ رہا تھا اور سامنے سے جیپ آ رہی تھی اور قریب آتی جا رہی تھی اور جیپ میں پولیس کے سپاہی تھے جن کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں اور جیپ آگے بڑھ رہی تھی اور مجمع آگے بڑھ رہا تھا۔ لوتیکا کے سارے خیالات، اس کا ذہن، اس کا دل و دماغ اور حواس سب اس جیپ سے چپک گئے تھے۔ یکایک جیپ مجمعے

سے کچھ دور رک گئی اور لوتیکا کو ایک دھچکا سا لگا اور یکایک اسے خیال آیا کہ میں نے آج منے کی نیکر دھلنے کے لیے نہیں دی اور پھر جیسے اس کے آگے لوتیکا کو کچھ یاد نہ رہا۔ جیسے ذہن پر سے کانچ کی شفاف سطح چھن سے ٹوٹ گئی اور اب وہ اس ٹوٹے ہوئے کانچ کے سوراخ سے باہر دیکھ رہی تھی۔

پولیس نے جلوس کا راستہ روک لیا تھا اور ایک افسر کہہ رہا تھا:

"جلوس آگے نہیں جائے گا۔"

لوتیکا کے قدم آپ ہی آپ آگے بڑھ گئے۔

قدم نہیں رکے، جھنڈے نہیں رکے۔

"شہر میں دفعہ ۱۴۴ نافذ ہے، جلوس نکالنا خلاف قانون ہے۔"

بھوک ہڑتال، لوہے کی سلاخوں کے پیچھے سے جھانک رہے تھے عورتوں کے قدم آگے بڑھ گئے۔

"میں حکم دیتا ہوں، یہ جلوس منتشر ہو جائے!"

لوتیکا کو یہ حکم بڑا سطحی سا معلوم ہوا جیسے دور طاق پر رکھا ہوا کوئی کھلونا بول رہا ہو۔

جلوس آگے بڑھتا گیا۔ سرخ سیندور کے ٹیکے قطار اندر قطار۔

"منتشر ہو جاؤ! ایک دم!!"

ایک دم لوتیکا کے ذہن کے دریچے میں دو آنکھیں چمکنے لگیں اور موہوم سا چہرہ۔

یہ کس کی آنکھیں تھیں؟ یہ کس کا چہرہ تھا؟ ہاں! یہ اس کے پتی کا چہرہ تھا۔ سیڑھیوں پر منا کھڑا تھا۔ پتلا پتلا کانچ جگہ جگہ سے ٹوٹ گیا تھا۔

یکایک لوتیکا کو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی چنگاری اس کے پیڈ میں گھستی چلی گئی ہے۔ ٹرام کے بجلی کے تار کی طرح اور وہ کراہ کے نیچے گر پڑی۔ منا سیڑھیوں سے نیچے گر پڑا اور پھر اچانک اندھیرا چھا گیا۔ بیچ میں ایک روشنی کی کرن سی تڑپی، آدھا خیال، ایک چوتھ خیال، دو آنکھیں، ایک چہرہ، پھر اندھیرا۔

تڑاخ، تڑاخ، تڑاخ۔

گولی چل رہی تھی۔

رضیہ نے گرج کر کہا: "زمین پر لیٹ جاؤ۔"

گولی سنسناتی ہوئی رضیہ کے پاس سے نکل گئی۔ رضیہ زمین پر لیٹ گئی۔

سارا مجمع زمین پر لیٹ گیا۔ بالاخانوں کے دریچے زور زور سے بند ہونے لگے۔ چیخ و پکار کی آوازیں آنے لگیں، پھر ایک دم سناٹا چھا گیا۔ ہوا میں صرف گولیوں کی آواز سنسناتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ نیلما گردن جھکائے زمین کے ساتھ لگی اپنی آنکھوں، ماتھے اور کانوں کو ہاتھوں سے ڈھانپے گلی کے کونے کی طرح گھسٹ رہی تھی۔ اس کا ہاتھ اُمیا گھوش کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ہاتھ پہلے چل رہا تھا پھر رک گیا۔ وہ ہاتھ پہلے گرم تھا پھر سرد پڑ گیا۔ نیلما نے ہاتھ

چھوڑ دیا۔ کسی کی بارات گزر گئی۔ امیا، نیلما آگے گھسٹنے لگی۔ آگے جا کے وہ پھسل گئی اور اس کے دونوں ہاتھ کسی کے خون میں تر بتر ہو گئے۔ نیلما نے ہلکی سی چیخ مار کے دیکھا پرنبھا مری پڑی تھی اور اس کے پلو میں بندھے ہوئے شلجم نکل کر لہو میں بھیگے ہوئے تھے۔ شلجم اور مچھلی کا شوربہ پر نبھا تو آج اپنے پتی مہاشے کو کیا کھلائے گی؟ نیلما آگے گھسٹنے لگی۔

ایک گولی زن سے آئی اور کوئی اس کے پیچھے زور سے چیخا۔ ایک لمحے کی لمبی چیخ جہاں زندگی ختم ہوتی ہے اور موت شروع ہوتی ہے یہ گیتا سرکار تھی۔ گولی اس کے بھیجے کو چیر کر پار ہو گئی تھی۔ قریب ہی ایک نوجوان لڑکا مرا پڑا تھا۔ پالش کی ڈبیہ اور برش اس کے ہاتھ میں تھا۔ یکایک نیلما کے دانت بجنے لگے اور اس کے منہ سے چیخیں نکلنے لگیں۔ رضیہ بھاگتی ہوئی اس کے پاس آئی:

"کیا ہے؟" اس نے پوچھا، "تمہیں کہاں چوٹ آئی ہے؟"

نیلما گھبرا کے اٹھی۔ مجمع چھٹ گیا تھا۔ کچھ لاشیں زمین پر پڑی تھیں، کچھ لوگ کراہ رہے تھے، کبوتروں نے ایوان کے قریب، یا دکانوں کے زینوں کے نیچے پناہ لی تھی۔

پولیس والے اب ہٹ کے ذرا دور کھڑے تھے۔ سارے بازار میں سناٹا تھا۔

نیلما نے پوچھا: "کیا ہوا؟"

رضیہ بولی: "اب سب کچھ ہو چکا، چلو لوتیکا کے پاس۔"

نیلما نے اپنے آپ کو دیکھا، اسے کہیں چوٹ نہیں آئی۔ اس پہ

وہ بڑی حیران سی ہو گئی۔ رضیہ کی بانہہ سے ایک گولی چھپھلتی ہوئی گزر گئی تھی۔

رضیہ اور نیلما لوتیکا کے پاس پہنچیں جو دھیمے دھیمے لہجے میں بڑی کراہ رہی تھی۔ اس کے پاس ہی منورما اوندھے منہ پڑی تھی، اپنے ہاتھ کانوں میں دیے۔

نیلما نے کہا: "اُٹھو منورما اُٹھو۔ دیکھو لوتیکا کراہ رہی ہے۔ آؤ اسے اُٹھا کے لے چلیں۔"

رضیہ نے کہا: "کسے اُٹھاتی ہو؟ منورما تو اب نہیں اُٹھے گی۔ اب تو وہ کسی کی نہیں سُنے گی۔"

نیلما نے آہستہ سے منورما کے ہاتھ اس کے کانوں سے الگ کیے ایک کرن پھول اس کے کان سے الگ ہو کے نیلما کے ہاتھ میں آ گیا۔ منورما سچ مچ سو رہی تھی۔ اس کے سینے میں ایک گہرا شگاف تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں، اس کے ہونٹ خاموش تھے اور اس کی کنواری چھاتیوں میں کسی نے مامتا کے سوتے خشک کر دیے تھے۔

"ہائے! ہائے!" لوتیکا آہستہ سے کراہی۔

رضیہ اور نیلما نے چاروں طرف دیکھا: سناٹا، جمود..... اور ہیبت ناک خاموشی، جیسے کائنات نے اپنا سانس روک لیا ہو اور زمین نے اپنے محور کا طواف چھوڑ دیا ہو۔

جوتوں کی ایک دکان کے اوپر بالا خانے میں سے ایک بڈھا

چینی نیچے جھانک رہا تھا۔ رضیہ نے اسے نیچے آنے کے لیے اشارہ کیا۔ بڈھے چینی نے غور سے نیچے دیکھا، اس کی دکان تو بند تھی۔ وہ اندر سے ہو کے باہر نہیں جا سکتا تھا۔ بالاخانے سے سڑک تک آنے کے لیے ایک زینہ ضرور تھا لیکن یہ زینہ باہر دیوار سے لگا تھا اور دیوار ننگی تھی اور پولیس والوں کی زد میں تھی۔ کہیں کوئی پناہ نہ تھی۔

بڈھا چینی زینے سے گھسٹتا گھسٹتا مکڑی کی طرح لگا لگا دیوار ٹٹولتا نیچے اُتر آیا۔ نیچے اُتر کر اس نے جلدی سے دکان کھولی اور پھر نیلما اور رضیہ کی مدد سے وہ لوتیکا کو اُٹھا کر دکان کے اندر لے آیا۔

سپاہی دور کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔

بوڑ بازار کے بالاخانوں کے اونچے دریچوں میں عورتیں کھڑی کھڑی رونے لگیں۔

مجمع آہستہ آہستہ پھر بیدار ہونے لگا۔ عورتیں فرش خاک سے اُٹھ کے زخمیوں کی دیکھ بھال کرنے لگیں اور اپنے ساتھ کی لاشیں دیکھنے لگیں۔

گیتا سرکار

میں گیتا سرکار ہوں۔ میری عمر اٹھارہ برس کی ہے۔ میرے ماں باپ بہت غریب ہیں اس لیے مجھے معلوم ہے، غریبی کیا ہوتی ہے میں آرجی کار میڈیکل کالج میں ایک نرس ہوں۔ مجھے ایک لڑکے سے محبت ہے، اس کا نام اجیت بوس ہے۔ وہ اگلے سال ڈاکٹری

کا امتحان پاس کر لے گا، پھر ہم دونوں کی شادی ہو جائے گی۔

نرڑاخ !

اُمیا گھوش

میں ہنسنے والی رنگیلی چڑیا ہوں جو ساون کے بادلوں میں اُڑتی ہے اور آکاش کی نیلی جھیل کے سپنے دیکھتی ہے اور رات کو اپنے چھوٹے سے گھونسلے میں بیٹھ کر اپنے دونوں بچوں کو دائیں بائیں سلا کر اپنی بانہیں پھیلا کے سو جاتی ہے۔ بچے کتنے پیارے ہوتے ہیں! گھونسلا کتنا آرام دہ ہوتا ہے! آج میں اپنے دونوں بچوں کو ایک عمدہ سی کہانی سناؤں گی اور وہ میرے نرم گرم سینے سے لگے کس طرح اپنی معصوم آنکھیں کھولے میری کہانی سُنیں گے اور کہانی سُنتے سُنتے سو جائیں گے۔

نرڑاخ !

منورما

میں جلسے سے فارغ ہو کر تمہیں چھ بجے اوڈین سینما کے باہر ملوں گی۔ تمہیں ہم تیرنے والی ننگی عورتوں کی رنگین فلم نہیں دیکھیں گے۔ ہم چارلی چپلن کی فلم دیکھیں گے جو رحم اور ترس اور نیکی کا فرشتہ ہے اور اگلے ہفتے جب ہماری شادی ہو جائے گی تو ہم پھر یہی فلم دیکھیں گے اور اسے دیکھ کر برداوان جائیں گے جہاں تمہارا گھر ہے جس کے آنگن میں تلسی کا پودا ہے اور پنجتارے کا پیڑ ہے۔ وہاں ہم چاندنی راتوں میں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیے گھنٹوں چپ چاپ

بیٹھے رہیں گے اور اس آنے والے بچے کا تصور کریں گے۔ جس کی خوشبو میں تلسی کا پودا مہکتا ہے۔ میں جلسے سے فارغ ہو کے چھ بجے ٹک ضرور اوڈین سینما کے دروازے پر پہنچ جاؤں گی۔ میرا انتظار کرنا۔

تمہاری !

پرتبھا گنگولی

گزر بھی جا کہ تیرا انتظار کب سے ہے۔

یہ ہم دونوں کا بیٹا ہے۔ ہم دونوں غریب ہیں۔ اس کے لیے کچھ نہیں کر سکے، لیکن اس بیٹے کا مستقبل بڑا امیر ہے کیونکہ یہ اس زمانے کا بیٹا ہے جو ہماری اُمیدوں کی کرن ہے۔ وہ لرزتی ہوئی خوشی کی کرن سامنے سے آ رہی ہے۔۔۔ گزر بھی جا کہ تیرا انتظار کب سے ہے۔

تمہاری !

پالش والا

میرا کوئی نام نہیں ہے۔ میرے باپ کا کوئی نام نہیں ہے۔ میری ماں کا کوئی نام نہیں ہے۔ میں کلکتے کی تاریک گلیوں کی پیداوار ہوں۔ میں غریبی اور سرمایہ داری کے آتشک کی اولاد ہوں۔ یہ آتشک آج بھی کلکتے کی روح کو ایک جونک کی طرح چوس رہی ہے۔ میں بوٹ پالش کرتا ہوں۔ لوگ چہرے چمکاتے ہیں، میں بوٹ چمکاتا ہوں۔ لوگ چہرے پڑھتے ہیں۔ میں بوٹ پڑھتا ہوں۔ میں ٹھوکروں میں رہتا ہوں۔ فٹ پاتھ پر سوتا ہوں اور ہوٹلوں کا جھوٹا کھانا کھاتا ہوں۔

میرا کوئی نام نہیں ہے۔ میں دراصل یونہی ان لڑکیوں کو بچانے آ گیا ورنہ مجھے اس جلوس کا کوئی علم نہیں ہے کہ یہ کیا ہے اُدھر جا رہا ہے۔ میں بس اتنا جانتا ہوں کہ جب عورت پر گولی چلتی ہے تو مرد سامنے آجاتا ہے کیونکہ عورت مرد کی ماں ہے اور ماں کو بچانا ہر بیٹے کا فرض ہے، چاہے اس بیٹے کو کوئی ماں اپنا بیٹا کہہ کے نہ پکارے۔

میرا کوئی نام نہیں ہے۔ میں شاید وہ معمولی بے نام شاعر ہوں۔ جو ہر صدی میں ظلم کے خلاف لڑتے ہوئے مارا گیا ہے۔ میں شاید وہ گمنام سپاہی ہوں جو ہر محاذ پر، ہر مورچے پر، ہر میدان جنگ میں شہید ہوا ہے۔ میں شاید وہ علمبردار ہوں جس کے فرشتوں کی طرح نیک اور محنتی ہاتھوں میں انقلاب کا پرچم لہراتا ہے۔

میرا کوئی نام نہیں ہے، میں شاید یہاں اپنی ماں کو ڈھونڈھنے آیا تھا۔

تڑاخ!

چینی بڈھے کی دکان میں نیلا نے لوتیکا کا سر اپنی گود میں لے کر پوچھا: "اب کیسی ہو لوتیکا؟"

لوتیکا کے چہرے پر چاچی ایسی مسکراہٹ آئی، بولی:

"اچھی ہوں، پیٹ میں معمولی سا درد ہے۔"

رضیہ نے کہا: "ابھی ایمبولنس آتی ہوگی۔ بڈھے چینی نے، خدا اس کا بھلا کرے، ابھی ایمبولنس کے لیے ٹیلیفون کیا ہے۔"

بڈھا چینی اتنے میں دکان کے اندر سے تھوڑی سی روئی لے کر آیا۔ بولا: "اس روئی کو پیٹ پر رکھ دو۔"

رضیہ بولی: "اس سے کیا ہوگا؟"

بڈھا ہاتھ ملتے ہوئے بولا: "اس سے کچھ نہیں ہوگا مگر کیا کروں، کیا کروں... کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

رضیہ بولی: "چپکے بیٹھے رہو، ایمبولنس آتی ہوگی۔"

بڈھا تھوڑی دیر کے لیے چپ رہا پھر کہنے لگا، "یہ چیانگ... یہ سب اسی چیانگ کی بدمعاشی ہے، میں سب جانتا ہوں۔"

رضیہ نے کہا: "کیسے باؤلوں کی سی باتیں کر رہے ہو، یہاں کہاں تمہارا چیانگ آگیا؟"

بڈھا چینی ہاتھ ملتے ہوئے بولا: "وہی ہوگا، وہی ہوگا! تم نہیں جانتیں، میں ساری دنیا گھوما ہوں، ہر ملک میں چیانگ ہے۔

چھوٹا چیانگ، پھر اس سے بڑا چیانگ، پھر اس سے بھی بہت بڑا چیانگ۔ چینی بڈھے نے ہاتھ پھیلا کے بہت بڑے چیانگ کی جسامت بیان کرتے ہوئے کہا، "اور یہ سب چیانگ مل کے ہم کو لوٹتے ہیں، ہم پر گولی چلاتے ہیں۔"

بڈھا چپ ہوگیا۔ تو تبکا ہولے ہولے کراہتی رہی... کان میں کلاک ٹک ٹک کرتا رہا۔

بڈھا پھر بولا: "ان تمام چیانگوں کو ختم کرنا ہوگا اور کوئی دوسرا

راستہ نہیں ہے۔ صرف پی پنگ کا راستہ ہے جہاں ہماری فوجیں خوشی کے شادیانے بجاتی ہوئی داخل ہو رہی ہیں۔"

یہ کہتے کہتے بڈھے کے مغموم چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ پی پنگ کا نام سن کے لوتیکا کے چہرے پر ایک عجیب مسکراہٹ سی آئی۔ بولی: "اب کتنی دیر ہے؟"

رضیہ بولی: "آ رہی ہے، لو وہ آگئی!"

ایک ایمبولنس دکان کے سامنے آ کے رکی۔ رضیہ نے کہا:

"لوتیکا تم گھبراؤ نہیں، اب تم بچ جاؤ گی۔"

لوتیکا نے بڑے اطمینان سے کہا: "ہاں، میں جانتی ہوں میں نہیں مروں گی۔"

ایمبولنس لوتیکا کو لے کے چل دی۔

رضیہ نے گرا ہوا جھنڈا اٹھا لیا۔ یہ جھنڈا اتنا لال کس لیے تھا؟ کیوں چمک رہا تھا؟ اس چمک میں اتنا بھرپور غصہ کیوں تھا؟ اس کالی بھجنگ عورت نے اُمیا گھوش کو اپنے کندھے پر اُٹھا لیا۔ چار مزدور عورتوں نے اس نوجوان لڑکے کی لاش کو اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیا۔ باقی لاشیں بھی مجمعے نے اُٹھا لیں۔ آہستہ آہستہ جلوس پھر آگے بڑھنے لگا۔ دکانیں کھلتی گئیں، لوگ غصے میں باتیں کرنے لگے۔ جلوس بڑھتا گیا اور بڑا ہوتا گیا۔ جھنڈا ہوا میں کھلتا گیا۔ جیسے کلکتے کی زندانی روح اپنی

بیڑیاں کاٹ کے اس جلوس میں شامل ہو رہی ہو لوگ باگ، دس، بارہ پندرہ، بیس، سو، ہزار ہزارہ کی گنتی میں آ کے اس جلوس میں ملتے گئے اور جوشیلے نعرے، نفرت اور غصے کے بھرے ہوئے نعرے لگاتے گئے۔ اب کسی کو گولی کا، دفعہ ۱۴۴ کا ڈر نہیں رہا۔ عورتوں نے شہیدوں کا لہو اپنے ماتھے پر لگا لیا اور سنگینوں کے آگے بڑھنے لگیں اور پولیس کے سپاہی پیچھے ہٹنے لگے۔ جلوس آگے بڑھتا گیا، کلکتے کے بازاروں میں کلکتے کی گلیوں میں، کلکتے کے کوچوں میں، لوگ سینما گھروں میں سے نکل آئے، کارخانوں میں سے نکل آئے۔ کلرک، طالب علم، دکاندار تماشائی مزدوروں کی رہنمائی میں آگے بڑھتے گئے۔ جلوس آگے بڑھتا گیا، جیل خانے کی طرف۔ اب جنتا باہر نکل آئی تھی اور ظالم زمین کے نیچے خندقوں میں چھپ گئے تھے۔

ایمبولنس بھاگی جا رہی تھی، اس کا بھونپو زور سے بار بار جھلاہٹ سے چلاتا اور ہر بار لوتیکا کو اس آواز سے اذیت ناک تکلیف ہوتی، یہ شور کس لیے ہے؟ یہ میرے پیٹ میں یکایک ہزاروں گولیاں سی کیوں چلنے لگی ہیں۔ یہ شعلے کیوں رگ رگ اور نس نس میں بھڑک رہے ہیں، یہ کرب ناک نشتر زنی کیوں ہے؟ جیسے جسم کا ہر حصہ گودے ڈالتا ہو۔ دور کی لہریں پیٹ میں اٹھتی ہیں، گھومتی ہیں، بھنور، دائرے، آگ کے شعلے، بھونچال، جلتا ہوا لاوا، میرے رام! کیا موت اسی کو

کہتے ہیں، جیسے جسم کے ذرے ذرے میں چھالے اُبل آئیں؟
ایمبولنس بھاگی جا رہی تھی، اس کی آہنی جالیوں کے باہر زندگی تھی۔ لوتیکا نے حسرت بھری نگاہوں سے باہر جھانکا۔ ایمبولنس ایک پانچ منزلہ عمارت کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ لوتیکا نے دیکھا کھڑکیوں میں رنگین پردے لہرا رہے تھے، دو لڑکے سگریٹ پیتے ہوئے بالکونی پر جھکے ہوئے ہنس رہے تھے، ایک دوشیزہ گلابی ساٹن کا بلاؤز سی رہی ہے، بوڑھی مائی تھیلے میں راشن لیے جا رہی ہے، ایک آدمی کوئلے کی بوری اٹھا رہا ہے، ماں بچے کو لیے کھڑکی میں کھڑی ہے، بچہ ہمکتا ہے اور مسکرا دیتا ہے، اُوپر آسمان گہرا نیلا ہے ــــ لوتیکا نے آنکھیں بند کر لیں، جیسے اس کے مرتے ہوئے جسم اور روح کو قرار آ گیا اور اس کے دل میں امن اور سکون اور شانتی کے گھنٹے بجنے لگے: موت کچھ نہیں ہے، زندگی ہی سب کچھ ہے، موت کچھ نہیں، زندگی ہی سب کچھ ہے، موت کچھ نہیں ہے، بچے کی مسکراہٹ ہی سب کچھ ہے۔ اور ایک لمحے میں لوتیکا دور کھڑکی میں کھڑی ماں کی گود سے، جیسے بچے کو اپنی گود میں لیا اور اسے چوم کر اسی لمحے میں اس کی ماں کے حوالے کر دیا۔

زندگی سے موت اور موت سے پھر زندگی کی طرف۔

لوتیکا سین اپنی زندگی کے آخری لمحے میں بھی صبح کے پہلے اُجالے کی طرح مسکرائی۔

مورگ۔
مورگ میں چھ لاشیں پڑی تھیں:
۱۔ لونیکا سین۔ ۲۔ امبا گھوش۔ ۳۔ پر تیما گنگولی۔ ۴۔ گیتا سرکار
۵۔ منورما۔ ۶۔ ایک بے نام لڑکا۔

یہ چھ کی چھ لاشیں مورگ میں ننگی پڑی تھیں۔ ان کے جسم پر کوئی کپڑا نہ تھا اور مورگ کے ملازم، انسان نما چیل اور گدھ جو سڑتے ہوئے سماج کے اندر سڑتے ہوئے گوشت اور پوست کی تجارت کرتے ہیں، ان لاشوں کے متعلق اپنے مخصوص گندے گھناؤنے انداز میں باتیں کر رہے تھے، مذاق کر رہے تھے، انھیں اپنی غلیظ تضحیک کا نشانہ بنا رہے تھے:

"سالی اچھی ہے!"
"کیسی گول گول اور گلگلی ہے!"
"ذرا اس کا جسم تو دیکھو لونڈیا ہے!"
"اس کا گوشت ابھی تک گرم اور نرم ہے۔"

نیلما نے جواب اپنی نرس کی ڈیوٹی پر واپس آگئی تھی۔ نگاہ اُوپر اُٹھا کے دیکھا: آسمان ننگا تھا، دھرتی ننگی تھی، آفتاب کی کرنیں ننگی تھیں اور سینا اور سادتری کے جسم ننگے تھے اور مورگ سے بہت دور کہیں ہزاروں میل پر والڈروف الیسٹوریا ہوٹل کے شاندار لاؤنج میں مسز وجے لکشمی پنڈت کہہ رہی تھیں: "ہندوستان میں

کمیونزم کبھی نہیں آسکتا اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہندوستان کی مرکزی کونسل میں اشتراکیوں کا ایک بھی نمائندہ نہیں ہے۔" اشتراکیوں کے نمائندے بے شک مرکزی کونسل میں نہیں ہیں لیکن وہ یہاں کلکتے کی مورگ میں ضرور موجود ہیں۔ کلکتے کی جیلوں میں قید ہیں پھانسی کے تختے پر لٹک رہے ہیں۔ والڈرف ایسٹوریا ہوٹل کا امریکی فوائر بہت خوبصورت ہے لیکن ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ اب یہ ہوٹل اور کوٹھیاں نہیں کریں گی۔ نیلما نے سوچا آج ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کلکتے کی مورگ میں ہو رہا ہے۔ کلکتے کی جیلوں میں ہو رہا ہے، کلکتے کی سڑکوں پر ہو رہا ہے۔ اس وقت نیلما کا جی چاہا کہ وہ ہزار میل دور بیٹھی ہوئی مسز نیڈرٹ کو پکار پکار کر کہے: "آؤ اور دیکھو کہ ہندوستان کی اس کھلی مرکزی اسمبلی میں جو ہندوستان کی سڑکوں، ملوں، چالوں اور آنگنوں میں منعقد ہو رہی ہے اشتراکیوں کا کوئی نمائندہ موجود ہے کہ نہیں!"

نیلما نے ان پانچوں لاشوں کی طرف پھر دیکھا:

مقدس اور ننگی لاشیں، جیسے اجول جوالا، بھڑکتا ہوا ننگا شعلہ تخلیق کی تڑپتی ہوئی بجلی! جیسے انقلاب اپنے خون سے ہنس دے اور جلتے ہوئے، سلگتے ہوئے انگارے پھول بن جائیں۔

بہت دیر تک یہ لاشیں ننگی پڑی رہیں۔

بہت دیر تک مورگ کے بے حس ملازم مذاق کرتے رہے۔

بہت دیر تک نیلما، نیلما عورت اور نیلما اس ہسپتال کی نرس مورگ کے ملازمین سے ان لاشوں کو ڈھک دینے کے لیے کہتی رہی۔

بہت دیر تک وہ لوگ مذاق اُڑاتے رہے، اور مذاق ہی مذاق میں بات کو ٹالتے رہے۔

نیلا، نازک مزاج، نفاست پسند نیلما کا چہرہ یکایک غصے سے سرخ ہو گیا۔ اس کی مٹھیاں تن گئیں اور اس نے بے دھڑک دونوں ہاتھوں سے اپنی ساری کھول ڈالی اور اُسے ان لاشوں پر ڈال دیا۔

اب وہ سب کے سامنے ننگی کھڑی تھی لیکن کس میں ہمت تھی جو اس وقت اس سے آنکھ ملا سکے۔ وہ اس وقت شوجی کی تیسری آنکھ تھی جسے دیکھتی بھسم کر ڈالتی۔ ایک ایک کر کے مورگ کے سارے ملازم وہاں سے کھسک گئے۔ پولیس کے سپاہی بھی شرمندہ ہو کے وہاں سے چلے گئے۔ اب وہاں کوئی نہ تھا۔ صرف نیلما شہیدوں کی لاشوں پر پہرہ دے رہی تھی۔

اتنے میں کچھ لوگ سفید چادریں لے آئے۔

رات بہت گہری ہو چکی تھی لیکن آج کلکتہ سویا نہ تھا۔ لوگ گلیوں اور بازاروں میں غصے اور رنج سے مغلوب ہو کے گھوم رہے تھے، کہیں فرار نہ تھا۔ کوئی اس شدید غصے اور نفرت کے جذبے

سے بھاگ کر کہیں پناہ نہ لے سکتا تھا۔ سرمایہ داری کے بڑھتے ہوئے تضاد نے دھوکے اور خود فریبی کے سارے راستے مسدود کر دیے تھے۔ نیلما تیز تیز قدموں سے گزرتے ہوئے یہ سب کچھ سوچ رہی تھی اور دیکھ رہی تھی کہ آج کلکتے کے لوگ پاگل ہو کے اپنی بے چین مٹھیوں کو بار بار بھینچتے ہیں اور انقلابی گیت گاتے ہوئے گلی کوچوں میں عوام کے دشمنوں کو ڈھونڈ رہے ہیں۔

چاچی کتنے عرصے سے بالکونی پر کھڑی بے ہم پتر اکے چڑھتے ہوئے پانی کو دیکھ رہی تھیں۔ منا ابھی تک سویا نہ تھا۔ وہ بھی آج بے قرار تھا، بے چین تھا اور اسے معلوم نہیں تھا کہ کون سی چیز ہے جو اسے یوں بے چین کر رہی ہے۔ گلیوں اور کوچوں اور بازاروں میں نعرے گونج رہے تھے۔ کبھی کہیں کوئی دھماکا ہوتا اور کبھی کہیں زور کی چیخیں سنائی دیتیں۔ تیز تیز قدموں سے بھاگنے کی آواز آتی اور پھر نعروں کے طوفان کے بعد یک لخت سناٹا سا چھا جاتا۔

ایک ایسے ہی سناٹے کے وقفے میں نیلما لونیکا کے گھر میں داخل ہوئی۔ چاچی نے سبزھیوں کی بتی روشن کی اور نیلما کو دیکھتے ہی اس کے چہرے کو پڑھ لیا کیونکہ چاچی نے زندگی میں آنسو ہی بوئے تھے اور آنسو ہی کاٹے تھے اور وہ اس فصل کو اچھی طرح پہچانتی تھی۔

نیلما چاچی کو الگ لے جا کر کچھ بات کرنے لگی۔ چاچی نے اسے

ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ کہنے لگیں: "کچھ نہ کہو، تمہارے چہرے نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ یہ بتاؤ وہ اس وقت ہے کہاں؟"

نیلما نے رندھے گلے سے کہا: "شہر سے آٹھ دس میل دور ایک پرانے گھاٹ کی چتا ہیں۔"

چاچی کی آنکھوں کی معصوم پتلیاں ایک لحظہ کے لیے زور سے کانپیں پھر ایک دم ساکت ہو گئیں۔ انہوں نے سیڑھیوں کے جنگلے کو زور سے پکڑ لیا۔

منے نے پوچھا: "ماں کہاں ہے؟"

نیلما نے کہا: "ماں نہیں آئے گی؟"

منے نے پوچھا: "ماں کیوں نہیں آئے گی؟"

نیلما نے بڑی مشکل سے کہا: "ماں بہت دور چلی گئی ہے۔"

چاچی روتے روتے بولیں: "کہاں ہو تم مہا کوی ٹھاکر؟ تم نے ننھا چاند لکھا تھا جس میں بچے کھو جاتے ہیں اور مائیں انھیں جوہی کے پھولوں میں تلاش کرتی ہیں۔ آج کلکتے میں مائیں جوہی کے پھول بن گئی ہیں اور ننھے ننھے بچے انہیں کلکتے کی گلیوں میں ڈھونڈ رہے ہیں۔ کہاں ہو تم مہا کوی ٹھاکر؟"

منا آہستہ سے چاچی کے پاس چلا گیا۔ بولا، "چاچی تو روتی کیوں ہے؟ میں جانتا ہوں ماں کہاں گئی ہیں۔"

"کہاں ہو؟"

"وہ یوجی ہو گئیں ہیں جیسے میرے پتاجی یوجی ہو گئے ہیں۔ پھر ایک دن میں بھی بڑا ہو کے یوجی ہو جاؤں گا اور ظلم کے خلاف لڑوں گا۔ رو نہیں چاچی!" نیلما نے اپنے بہتے ہوئے آنسو پونچھے بغیر منے کے ہاتھ میں لو نیکا کا خریدا ہوا باجہ تھما دیا۔

باجے کو دیکھ کے منے کو ایسا معلوم ہوا جیسے وہ اپنی ماں کے مسکراتے ہوئے چہرے کو دیکھ رہا ہو۔ اور جب اس نے باجے کو ہونٹوں سے لگایا تو نیلما کو ایسا معلوم ہوا کہ لو نیکا اپنے مامتا بھرے ہونٹوں سے اپنے پیارے بچے کو چوم رہی ہے۔

باہر طوفان گرج رہا ہے۔

اندر منا باجہ بجا رہا ہے۔

موم کی چٹان

شوکت اور اللہ داد نے گومتی کو کمرے سے دوڑتے ہوئے دیکھا اسے برآمدے میں سے ایک مست ادا سے بھاگتے دیکھا۔ شوکت اور اللہ داد برآمدے کے باہر کے خوبانی کے درخت تلے دو اور سپاہیوں کے ساتھ تاش کھیل رہے تھے۔ شوکت سے نہیں رہا گیا۔

بولا: "اللہ داد بڑی زناٹے کی عورت ہے۔ خدا کی قسم ایک دفعہ جس کو نظر بھر کے دیکھ لے وہ ہل نہیں سکتا، وہیں سل پتھر ہو جاتا ہے۔"

اللہ داد آہ بھر کے بولا: "اپنا اپنا نصیب ہے۔"

شوکت نے کہا: "آہیں کیوں بھرتے ہو۔ بڑی مرد مار عورت معلوم ہوتی ہے کیا عجب کبھی تم پر..."

اللہ داد نے جلد ہی اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ بولا:

"غضب ہو جائے گا شوکت۔ تھانیدار نے سن لیا تو چکدم بنا دے

گا۔ تم نہیں جانتے ہو اس خبیث کو، وہ بری طرح اس عورت کے جال میں گرفتار ہے۔"

شوکت نے پتہ پھینکتے ہوئے کہا: "اپن تو پروا نہیں کرتے مگر نہ جانے کیوں اپنے کو یہ عورت اچھی نہیں لگتی۔ جو مزہ خون، پسینے میں ہے کسی اور مزے میں نہیں یار! میں تمہیں رامپور کا قصہ سناؤں۔ ایک دفعہ کیا ہوا کہ ایک عورت مجھ پر بری عاشق ہو گئی۔"

اللہ داد نے سارے پتے پھینک دیے اور اُٹھ کے بولا:

"ہٹاؤ یار کوئی بات کرو جی نہیں لگتا۔"

"کیوں، کیا ابھی تک ستا رہی ہے؟"

اللہ داد خوبانی کے درخت کے نیچے اِدھر اُدھر ٹہل کر کہنے لگا: "اس کی بات چھوڑو، یہ چڑیا اپنے پنجرے کی نہیں ہے۔"

"پھر کس پنجرے کی بات کرتے ہو؟ چار تو تمہارے گھر میں ہی ہیں۔"

"چار سے کیا ہوتا ہے۔" اللہ داد آہ بھر کے بولا، "چار تو شروع سے ہی جائز ہیں۔ میں اب پانچویں کے چکر میں ہوں۔"

شوکت نے اللہ داد کو سر سے پاؤں تک دیکھا: "ہاں تمہارے ڈیل ڈول والے آدمی کو تو سرکاری سانڈ کی طرح پالنا چاہیے۔"

اللہ داد ہنسنے لگا اور اپنے بازوؤں کی اُبھری مچھلیاں فخر سے دیکھنے لگا۔

شوکت نے ایک عجیب مایوسی کے عالم میں اس سے کہا:
"عورتیں تمہیں بہت پسند کرتی ہوں گی۔"
اللہ داد کا چہرہ مسرت سے سرخ ہو گیا۔ اس کا منہ پھول گیا
اور گردن کی رگیں تن گئیں۔
شوکت نے کہا: "اپن کو عورت بالکل پسند نہیں۔ جانے اس
نے کیا ہے۔ اتنا ضرر پتا ہے جب چاقو انسانی جسم میں چلاتا ہوں تو
مکھن کھیرا کاٹنے کا سا مزہ آتا ہے۔"
اللہ داد نے کہا: "میری پانچویں بھی ہرے ہرے کھیرے کی طرح
لچکیلی، نرم اور ملائم ہے۔ اس کا نام نوراں ہے۔ نوراں! سچ مچ نور
ہی ہے۔ دیکھنے میں روشن اور چمکتی ہوئی سولہ سترہ برس کی۔ میں نے
اس کے باپ کو پانسو روپے دیے ہیں۔"
"نکاح کے لیے!"
"نہیں نکاح کے لیے ساڑھے سات سو اور دوں گا۔ پانسو
میرے پاس جمع ہو گئے ہیں۔ دو چار دن یہی ہلہ اور رہا تو دو سو اور
بھی اکٹھے کر لوں گا۔"
"پھر؟" شوکت نے ہونٹوں پر زبان پھیر کے کہا۔
"پھر اپنے گاؤں میں شادی کے ڈھول بجاؤں گا: ڈرڈرڈگڑ،
ڈرڈرڈگڑ۔ اللہ داد اپنے پیٹ پر ڈھول بجا کر ناچنے لگا۔ شوکت
اور دوسرے سپاہی ہنسنے لگے۔

شوکت نے سوچ سوچ کے کہا: "سنو تو تم پانچ کو کیسے رکھ سکو گے۔ کسی ایک کو طلاق دو گے نا؟"

"ہاں! یہی کرنا پڑے گا۔"

شوکت نے کہا: "مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ایک بیوی ڈھوڑنگر چرانے گھاٹی پر جائے اور ہاں اس کا پاؤں نیچے پھسل جائے اور وہ کھڈ میں گر کر مر جائے۔" "ہو سکتا ہے۔" اللہ داد آہستہ سے بولا۔

"اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ آنگن میں رات کو سو جائے اور رات ہی کو جنگل کے بھیڑیے اسے اُٹھا کے لے جائیں اور دوسرے یا چوتھے روز اس کی لاش....." اللہ داد اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے آہستہ سے بولا: "ہاں ہو تو سکتا ہے۔"

شوکت نے اپنا چاقو نکال کے اور اس کا پھل آنکھوں کے سامنے رکھ کے کہا: "مجھ سے کوئی مدد مانگتے ہو تو میں حاضر ہوں۔"

اللہ داد نے ہنس کر شوکت کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا:

"تمہارے ایسے دوستوں ہی کا تو سہارا ہے۔ حالانکہ کوئی ایسی گڑبڑ کی ضرورت نہیں۔ طلاق بھی فوراً مل سکتی ہے اور اگر دیر بھی ہو تو نوراں کے باپ کو یہ دھوکا بھی دیا جا سکتا ہے کہ میں ابھی تک کنوارا ہوں اور میرا نام اللہ داد نہیں رحمت خاں ہے۔"

شوکت نے چاقو بند کر کے جیب میں ڈال لیا اور مایوسی سے سر ہلا کر بولا: "جاؤ تم سے کیا بات کریں، تم ہماری لائن کے آدمی نہیں ہو۔"

اللہ داد زور سے ہنسنے لگا۔ پھر یکایک چپ ہو گیا کیونکہ گومتی اب ایک چھوٹی سی مٹکی اُٹھائے ان کی طرف چلی آ رہی تھی۔ اللہ داد نے زیرِ لب کہا: "اسے اِدھر نہیں آنا چاہیے۔ جانتی ہے ہم سپاہی لوگ ہیں، پھر بھی اِدھر آ رہی ہے۔ اسے دیکھ کر دل میں کچھ ہونے لگتا ہے۔ مجھ سے کسی روز کچھ ہو جائے گا تو ننھا بیدار اور لالہ اپنی جان کو رو دیں گے: یا خدا یہ اِدھر نہ آئے، یا خدا یہ اِدھر نہ آئے۔"

مگر گومتی دھیمی چال سے چلتی ہوئی اِدھر ہی آ رہی تھی: "مویشی خانے کی چابی مجھے دے دو۔"

اللہ داد چپ رہا۔

شوکت نے کہا: "کیوں؟"

"دودھ دوہنے جا رہی ہوں۔"

شوکت بولا: "اندر بڑا خطرناک ملزم بند ہے۔ اس کی ہتھکڑیاں بھی کھلی ہیں۔"

گومتی نے مسکرا کے اللہ داد کی طرف دیکھا، بولی: "وہ مجھے کچھ نہیں کہے گا۔ پھر تم دونوں یہاں سامنے کھڑے ہو اور دو ہی تو انڈی کا دروازہ ہے۔ اگر وہ یہاں سے بھاگا تو دروازہ سامنے ہے۔ تمہارے سامنے سے بھاگ کے کہاں جائے گا؟"

اللہ داد نے کہا: "ہمیں اپنی فکر نہیں تمہاری فکر ہے۔"

گومتی نے معنی خیز نگاہوں سے اللہ داد کی طرف دیکھ کے کہا:

"میں اپنی فکر خود کر لوں گی۔"

اللہ داد نے شوکت کے ہاتھ سے چابی لے کے گومتی کو دے دی۔ ایک لمحے کے لیے اس کا ہاتھ گومتی کی انگلیوں سے مس ہوا اور ایسا محسوس ہوا جیسے ان میں سے کوئی شعلہ تڑپ کر بھڑک اٹھا۔ گومتی گھوم کر چلی گئی۔ اللہ داد اسے دیکھتا رہ گیا۔

شوکت نے سر ہلا کے کہا: "اپن کو بالکل پسند نہیں۔ اگر مجھے دنیا کی کوئی سب سے خوبصورت عورت لا کے دے اور ایک طرف وہ عورت اور دوسری طرف یہ چاقو رکھ دے تو میں اپنا چاقو اٹھا لوں ....."

اللہ داد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ گومتی کو دیکھ رہا تھا۔ گومتی بانڈی کے دروازے پر پہنچ گئی۔ پھر اس نے چابی لگا کے تالا کھولا۔ پھر دروازہ کھلا پھر دروازہ بند ہو گیا۔

بانڈی کے بدبو دار دھیال پر پڑے پڑے عبدل نے پوچھا:

"کون ہے؟"

ایک لمحے کے لیے اس نے دیکھا کہ دروازے کی پتلی دراز میں ایک حسین عورت کھڑی ہے۔ حسین عورت، حسین لڑکی نہیں۔ پھلدار درخت کی طرح تنگفتہ اور شاداب عورت دروازے میں کھڑی ہے۔ ایک لمحے کے لیے اس کے نتھنوں میں ایک بے نام سی مہک لہرائی۔ پھر دروازہ بند ہو گیا اور نیم تاریکی اور نیم روشنی اور مویشی

خانے کی نیم گرم فضا میں اس نے اس عورت کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔

گومتی خاموش قدموں سے چلتے ہوئے بالکل اس کے سر پر آن پہنچی۔ ایک لمحے کے لیے وہاں رکی، عبدل اُٹھ کے بیٹھ گیا۔ لیکن گومتی نے اسے کچھ نہیں کہا۔ وہ وہاں سے گھوم کر اپنی دودھیلی گائے کے پاس چلی گئی اور بچھڑے سے گائے کے تھنوں میں دودھ اُتروا کر بچھڑا قریب میں باندھ کے دودھ دوہنے لگی۔

عبدل نے کہا: "شاہنی! پہلے میں نے تمہیں پہچانا نہیں۔ ان پانچ سالوں میں تم میں بڑا فرق پیدا ہو گیا ہے۔"

گومتی نے کہا: "پہلے میں نے بھی تمہیں نہیں پہچانا۔ پانچ سال پہلے تم بالکل لڑکے سے تھے۔"

عبدل نے کہا: "شاہنی، انھوں نے میرے باپ کو بے قصور مار دیا ہے۔"

گومتی چپ چاپ دودھ دوہتی رہی اور دودھ کی سفید سفید برف کی طرح چمکتی ہوئی دھاریں مٹکی میں گونج پیدا کرتی ہوئی گرتی رہیں۔ عبدل کو ایسا معلوم ہوا جیسے یہ دھاریں اس کے گلے میں گر رہی ہوں۔ وہ اپنے حلق پہ ہاتھ رکھ کے بولا:

"شاہنی میں نے کل شام سے کچھ نہیں کھایا۔"

گومتی چپ چاپ دودھ دوہتی رہی۔

بچھڑے نے دودھ کو دیکھ کے زور سے اپنی ماں کو آواز دی۔

گائے زور سے ڈکرائی۔

دودھ مٹکی میں گرتا گیا۔

عبدل بھوک اور پیاس سے سخت بے تاب تھا۔ وہ دودھ کی دھاروں کی "دھاں! دھاں!" نہیں سُن سکتا تھا۔ اس نے اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیں اور دھیال میں اپنا منہ چھپا لیا۔

گومتی نے دیکھا کہ مٹکا جھاگ سے چھلک رہا ہے۔ وہ آہستہ سے گائے کے پاس سے اُٹھی، بچھڑے کو پھر سے کھول کے گائے کے پاس جانے دیا۔ بچھڑا بھاگتا ہوا ماں کے تھنوں کے پاس گیا اور منہ مار کے چپسر چپسر دودھ پینے لگا۔

مٹکا جھاگ سے چھلک رہا ہے۔

عبدل دھیال میں منہ چھپائے لیٹا ہے۔

گومتی اس کے سر پہ کھڑی ہے۔

گومتی نے کہا: "اُٹھو دُودھ پی لو۔"

عبدل لیٹا ہوا تھا، اُٹھ کر بیٹھ گیا اور اب کھڑا ہونے والا تھا کہ گومتی جھک کر اس کے پاس بیٹھ گئی اور اس کے کندھے سے لگ کر اس نے مٹکی کو اس کے منہ سے لگا دیا۔ عبدل غٹاغٹ دودھ پیتا گیا۔ مٹکی پہلے چھلک رہی تھی۔ پھر وہ جھاگ جیسے اندر جاتا ہوا معلوم ہوا۔ پھر مٹکی پونی ہوگئی پھر مٹکی آدھی، پھر خالی ہو گئی۔

اب صرف عبدل کے ہونٹوں کے گرد دودھ کا جھاگ لگا ہوا تھا۔
گومتی نے اپنے مہین ململ کے پلو سے اس کے ہونٹوں کے گرد جھاگ کو پونچھ دیا۔ اس کی ٹھوڑی اور نتھنوں کے گرد جمے ہوئے خون کو صاف کیا۔ عبدل نے ایک دو بار اس کا ہاتھ روکا مگر وہ ہاتھ رک نہیں سکا۔ عبدل کے اپنے ہاتھ بالکل کمزور پڑ گئے اور اس کے چاروں طرف ایک عجیب سی خوشبو، ایک عجیب سی سنسنی، ایک عجیب سی ملائمت پھیل گئی۔
گومتی نے کہا: "میں نے سنا ہے تم شہر میں سکول ماسٹر ہو اور آٹھویں پاس ہو۔"
"ہاں۔" عبدل بولا، "اور اب میں دسویں کا امتحان دینے راولپنڈی جا رہا تھا کہ۔۔۔"
"راولپنڈی!" گومتی بڑی مدھم آواز میں بولی، "میں ایک بار شادی سے پہلے راولپنڈی گئی تھی۔ اپنے قصبے بھون سے راولپنڈی گئی تھی۔ وہاں راولپنڈی میں میرا ایک رشتے دار رہتا ہے، سجن دیو، پہلے میری اس سے شادی ہونے والی تھی پھر پتا چلا کہ وہ ہمارا رشتے دار ہے اور ہماری شادی نہ ہو سکی۔ کیوں جس سے ہم پیار کرتے ہیں اس سے ہم شادی نہیں کر سکتے۔" گومتی نے عبدل سے پوچھا۔
عبدل نے کوئی جواب نہیں دیا۔
گومتی نے کہا: "تم راولپنڈی جاؤ گے تو سجن دیو سے ضرور ملنا،

ضرور۔ اب اس نے بھی شادی کر لی ہوگی۔ اس کے بال بچے ہوں گے۔ ضرور جانا اس کے پاس۔ دیکھنا اس کی بیوی کیسی ہے، خوبصورت ہے کہ... مگر ضرور خوبصورت ہوگی... دیکھو وعدہ کرو کہ جب تم راولپنڈی جاؤ گے تو...

عبدل نے کہا: "فی الحال تو میں جیل جاؤں گا۔"

"جیل کیوں جاؤ گے؟ نہیں نہیں، تم ضرور راولپنڈی جاؤ گے۔ میں تمہیں راولپنڈی بھیج کے رہوں گی۔"

عبدل نے کہا: "وہ کیسے؟"

گومتی نے کہا: "تم دیکھتے جاؤ۔"

اتنا کہہ کے گومتی نے عبدل کے گلے پر اپنے پتلے پتلے ناخن پھیر کے جمے ہوئے خون کی دھاروں کو صاف کیا۔ عبدل کے گلے کی رگیں کیسی صاف، سیدھی تنی ہوئی تھیں۔ نیچے حلق کے نیچے کی دو مضبوط ہڈیاں... گومتی آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرتی گئی۔ عبدل گھبرا گیا۔ بولا:

"وہ — میں تم کیسے... میری مدد کرو گی۔"

گومتی مسکرائی اور اس کے سینے کا ابھار عبدل کو اپنے سینے سے اٹھتا ہوا معلوم ہوا۔ جیسے پھلوں سے لدی پھندی شاخیں یکایک طوفان کے جھونکے سے اوپر اٹھ جائیں۔ عبدل بالکل چوکنا ہو کہ اور کچھ مایوس ہو کہ گومتی کو کھڑا ہوتے ہوئے دیکھنے لگا۔ گومتی نے مٹکی اٹھائی۔ پھر اس نے ایک عجیب انداز سے اس کی طرف دیکھ

کر ہوا کے جھونکے کی طرح لطیف آواز میں کہا: "اچھا میں رات کو آؤں گی۔"

اتنا کہہ کے گومتی منہ پھیر کے چل دی اور عبدل کوئی احتجاج نہ کر سکا، کوئی انکار نہ کر سکا۔ کیوں آئے گی؟ وہ اس کی کون ہے؟ وہ اس کا کون ہے؟ وہ کیسے آسکتی ہے؟ کس لیے اس نے اسے مسخ نہیں کیا؟ یہ کیسا جذبہ ہے، کس طرح کا احساس ہے جس نے اس کی زبان بند کر دی ہے۔ عبدل ان سوالوں کا کوئی جواب نہ دے سکا۔ سوا ں دودھ کے بلبلوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کے اس کے ذہن میں گم ہوتے گئے۔

بانڈی!

بانڈی سے باہر نکل کے گومتی نے چابی اللہ داد کو دے دی۔

شوکت نے پوچھا: "مٹکی خالی ہے شاہنی!"

گومتی نے کہا: "تمہارے ملزم نے کل شام سے کچھ نہیں کھایا۔"

اللہ داد نے کہا: "تھانیدار کا حکم تھا اسے کچھ نہ دیا جائے۔"

گومتی نے کہا: "اچھا تو پھر اللہ داد تھانیدار سے کچھ نہ کہنا، میں رات کو بھی اسے کھانا کھلاؤں گی۔"

گومتی معنی خیز نظروں سے اللہ داد کو دیکھ کر مسکرائی۔

ایسی صاف اور روشن مسکراہٹ تھی وہ، اللہ داد بھونچکا سا رہ گیا۔ کانپتے ہوئے لہجے میں بولا:

"بہت اچھا شاہنی!"

جب گومتی چلی گئی تو شوکت نے کہا: "تم اچھا نہیں کر رہے ہو دوست!"

اللہ داد خوبانی کے آس پاس گھوم کر ٹہلنے لگا۔ پھر اس نے رک کر شوکت سے اونچی آواز میں کہا: "بھاڑ میں جائے تھانیدار۔"

اللہ داد خود اپنی اونچی آواز پہ حیران رہ گیا۔

گومتی برآمدے میں سے گزرتی ہوئی اپنی جسارت پہ مسکرائی۔ پھر اس نے چھپتے ہوئے برآمدے میں کھڑے ہو کر دیکھا کہ گل ایک تنگ قمیض اور بڑے گھیرے والی نئی شلوار پہنے جنوبی راستے سے اس کے مکان کی طرف آ رہی ہے۔ گل بڑی ہی خوبصورت لڑکی ہے، گومتی نے سوچا۔ کئی سالوں سے میراں شاہ اس کے ساتھ منہ کالا کرنا چاہتا ہے۔ مگر آج تک اس کی ہمت نہیں ہو سکی۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ گل کو اس کا پتا نہ ہو، آخر عورت ہے وہ ضرور جانتی ہو گی۔ جب لالہ میراں شاہ حیران نظروں سے اسے دیکھتا ہے تو وہ کیا دیکھتا ہے جب وہ گل کی جھولی گری، چھوارے اور مخانوں سے بھر دیتا ہے تو اس کے ہاتھ کیوں کانپ رہے ہوتے ہیں۔ جب اس نے جی کڑا کر کے گل کو ریشمی سوسی کی قمیض اور شلوار کا کپڑا بھی مفت دے دیا تھا۔ اس وقت اس کے دل کی کیا حالت تھی، مگر گومتی کو خوب معلوم تھا کہ اس کا خاوند صرف قدموں میں لوٹ سکتا ہے، محبت نہیں کر سکتا

اس میں یہ ہمت بھی نہیں کہ گل سے کہہ سکے: میں تیرا دل چاہتا ہوں۔
بزدل!

گومتی نے گل کو جنوبی پگڈنڈی سے اوپر چڑھتے اور پھر اسے لالہ میراں شاہ کے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ وہ مسکرائی۔ اتنے میں اسے اپنے قریب قدموں کی آواز سنائی دی۔ اس نے پلٹ کے دیکھا: ٹھاکر کاہن سنگھ اپنی مونچھوں کو تاؤ دے رہے تھے اور مسکرا رہے تھے۔

گومتی نے پوچھا: "راجہ جی کیسے ہیں؟"

"شہر سے ڈاکٹر آیا ہے کہتا ہے مہینے بھر میں اچھے ہوں گے۔"

گومتی چپ رہی۔

ٹھاکر کاہن سنگھ نے کہا: "ہم نے سوچا چلو شاہنی کو دیکھ آئیں اور اپنے یار تھانیدار سے بھی دو دو باتیں کر لیں۔"

گومتی مسکرائی۔ بولی: "آج یہیں رہیے نا، شہر سے نئی شراب منگائی ہے اور ——" ٹھاکر کاہن سنگھ نے بالکل قریب آ کے پوچھا۔

گومتی ذرا پیچھے ہٹ گئی۔ بولی: "اور ایک نئی بوتل بھی ہے۔"

"کہاں؟"

"وہ سامنے لالہ کے کمرے میں، ابھی آپ کو دکھاتی ہوں۔"

لالہ، گل کو اپنے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر کچھ گھبرا سا گیا۔

گل اتنی اچھی معلوم ہو رہی تھی، اتنی پیاری جیسے اس کے کمرے میں بہار کا جھونکا آگیا ہو۔ لالہ اس وقت تراز و میں کچھ سامان تول رہا تھا۔ اس کے ہاتھ سے تراز و ڈگمگا کے چھوٹ گیا اور لالہ بالکل گڑبڑا کے کہنے لگا: "ارے گل تم ہو!"

گل کے مہندی بھرے ہاتھ چمکے اور اس کی ایک انگلی اس کی ستواں ناک کی گول اور سنہری کیل پر رک گئی۔ وہ شرما کے اور لجا کے بولی:

"جی، شاہ جی۔"

گل زمین پر بیٹھنے والی تھی کہ لالہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کے کہا:
"ارے کیا کرتی ہو، یہاں۔ یہاں۔ یہاں تخت پوش پر بیٹھو۔ وہ گل کو ہاتھ سے پکڑ کے تخت پوش پر لے آیا۔ اس نے بھی کھاتے سمیٹ کے الگ رکھ دیے اور ہاتھ ملتے ہوئے بولا:

"بولو کیا چاہیے تمہیں؟"

"کچھ ارسے دوں؟ مخانے، مصری نئی آئی ہے۔ شیشہ، کنگھی نئی پھول دار چھینٹ۔ گل کیا چاہیے تمہیں؟"

گل ہنسی۔ جیسے اسے اپنی طاقت کا احساس ہو۔ بولی:

"لالہ مجھے کانچ کی ستریاں اور گلے کی وہ ہرے رنگ کی مالا دے دو تو بڑی مہربانی ہو گی تمہاری۔"

"ارے مہربانی کیسی؟ مہربانی کیسی۔ گل یہ لو، یہ لو۔۔۔ تمہارے

لیے تو۔ مگر اچھا۔ لالہ ایک عجیب حسرت سے گل کو دیکھ کے کہنے لگا:
"سُنا ہے بھادوں میں تمہاری شادی ہونے والی ہے!"
گل نے لجا کے گردن جھکا لی۔ اس کا چہرہ گردن سے لے کے جبین تک سرخ ہو گیا۔
لالہ ہاتھ ملنے لگا: "ہائے! گل چلی جائے گی۔ یہ سونے کی مورت، یہ ناز و ادا کا پیکر، یہ موہنی مورت بھی اس گاؤں سے چلی جائے گی۔" میراں شاہ چپ ہو گیا۔ ایک بار اسے اپنے گدھے سے پیار ہوا تھا۔ ایک بار اس نے گومتی کو چاہا تھا لیکن دولت کے سوا کسی نے اسے نہ چاہا اور دولت کو چاہنا ایسا ہی ہے جیسے آدمی گدھے سے محبت کرے۔ اتنی دولت پا کر بھی میراں شاہ کے دل میں راکھ اُڑ رہی تھی اور زبان پر مٹی کا ذائقہ تھا اور وہ گل کو دیکھ کر حسرت سے ہاتھ مل رہا تھا۔
گل نے اپنی چیزیں سمیٹ کے کہا: "اچھا تو میں جاؤں۔"
پچھلے چار سال سے یہی ہو رہا تھا۔ گل آتی، چند چیزیں پسند کر لیتی لیکن چیزیں دینے والے کو کبھی اپنی پسند کا موقع نہ دیتی پھر ایک رذیل بزدل، مگر وہ لمحہ آتا جب وہ دونوں چپ ہو جاتے گل اس لیے کہ وہ احسان نہ چکا سکتی تھی۔ لالہ اس لیے کہ وہ یہاں پر اسے احسان نہیں سمجھتا تھا۔ اس لیے یہ لمحہ بڑا خاموش اور طویل ہو جاتا۔ ایک عظیم غبارے کی طرح پھولتا جاتا حتیٰ کہ حبب لالے کو

معلوم ہوتا کہ یہ غبار اب پھٹ پڑے گا تو وہ ایک عجیب سی آواز میں کہتا:

"اچھا تو تم جاؤ گل۔" اور گل چلی جاتی لیکن آج نہ جانے کیوں لالہ یہ بھی نہ کہہ سکا۔ صرف حسرت بھری نگاہوں سے اسے چپ چاپ دیکھتا رہا اور گل نے آہستہ آہستہ اپنے قدم باہر بڑھائے۔

یکایک لالے نے کہا: "اے گل... ہماری گائے نے بچھڑا دیا ہے، بڑا ہی خوبصورت۔ اس کے ماتھے پر سفید تارہ بھی ہے، تو دیکھے گی؟"

"کہاں ہے۔"

"باندی میں!"

گل نے سوچا احسان چکانے کا لمحہ آگیا۔ احسان آخر احسان ہی ہوتا ہے، محنت نہیں ہوتا۔ ان پچھلے چار سالوں میں لالہ اسے برا اور مکروہ ضرور معلوم ہوتا تھا مگر کبھی اتنا برا اور مکروہ نہیں معلوم ہوا تھا جتنا اس وقت۔ اس سے پہلے لالے کی خاموشی میں ایک عجیب رقت آمیز خوشامد کی قی ہوئی محبت کا شائبہ سا محسوس ہوتا تھا۔ آج اس میں صرف بدبو تھی، خالی گندی بدبو۔

گل نے شکایت آمیز لہجے میں کہا: "لالہ بھادوں میں میری شادی ہونے والی ہے۔"

لالہ اس کا ہاتھ پکڑ کے اسے باندی کی طرف کھینچ کے لے جانے

لگا: "ارے بڑا اچھا بچھڑا ہے، بڑا ہی خوبصورت۔ یہ قریب ہی تو مویشی خانہ ہے۔"

گل انکار کرتی گئی، جوں جوں بانڈی قریب آتی گئی، لالے کا اصرار بڑھتا گیا اور گل کی مزاحمت بڑھتی گئی۔ اب لالہ بالکل اپنے آپے سے باہر ہو گیا تھا۔ اس کا دم پھول رہا تھا اور چہرہ غصے سے سیاہ ہو گیا تھا۔ اسے اپنے آپ پر، اپنی ترچھی ناک پر، اپنی بدصورتی پر، اپنی کمینگی پر، گل کے حسن پر، گومتی کی بے وفائی پر غصہ آ رہا تھا وہ کیوں غصہ نہ کرے۔ کیا اس کا غصہ بجا نہ تھا؟ گل کو یہ احسان چکانا ہو گا۔ آخر یہ احسان ہو کر رہا۔ یہ جذبہ بھی محبت نہ بنا، کیوں وہ اسے بانڈی کی طرف گھسیٹ رہا تھا۔ یکایک اس کے کانوں میں ہنسی کی آواز آئی۔ اس نے گھوم کر دیکھا، شوکت اور اللہ داد اس کی طرف دیکھ کر ہنس رہے تھے۔

لالہ رک گیا۔

اللہ داد نے کہا: "کیا بات ہے لالہ، کدھر جا رہے ہو؟ بانڈی میں تو ہمارا قیدی بند ہے۔"

یکایک لالے کو یاد آیا اور اس کی گرفت گل کے ہاتھ پر ڈھیلی ہو گئی۔ گل ہاتھ چھڑا کے جلدی سے بھاگی اور شوکت اور اللہ داد کے قریب سے ہوتی ہوئی خوبانی کے درخت سے گزرتی ہوئی باڑھ کو پھلانگ کے نیچے رستے پر جانے والی تھی کہ کوئی بالکل اس کے

سامنے آگیا اور اس نے اسے مضبوط ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ گل نے گھبرا کر دیکھا: سامنے ایک لمبا تڑنگا جوان آدمی لمبی مونچھیں رکھے کھڑا ہے اور اس کے پاس گومتی کھڑی ہے اور وہ اس جوان کی مضبوط باہوں میں ہے۔

"ہٹو مجھے چھوڑ دو۔"

"اسے یہ تو سچ مچ نئی بوتل ہے۔" کاہن سنگھ نے خوش ہو کے کہا۔

گومتی نے کہا: "بھادوں میں اس کا بیاہ ہونے جا رہا ہے۔

"مجھے جانے دو۔" گل چلائی۔

"بھادوں تو بہت دور ہے اور رات آج جوان ہے اور میرے ہاتھ بہت مضبوط ہیں۔"

رات آج جوان ہے اور گل ٹھاکر کاہن سنگھ کے کمرے میں ہے۔ رات آج جوان ہے اور گومتی تھانیدار حشمت اللہ بیگ کے کمرے میں ہے۔ رات آج جوان ہے اور سپاہی خوبانی کے پیڑ کے نیچے تاش کھیل رہے ہیں۔

رات آج جوان ہے اور دولت بوڑھی ہو چکی ہے اور لالہ میراں شاہ اپنے دل کی ساری جھریاں گنتا ہوا کبھی اس کمرے سے اس کمرے، کبھی اس برآمدے سے اس برآمدے میں جاتا ہے اور سوچتا ہے کیا وہ کسی طرح اس

جوان رات کے سینے میں گھونسا نہیں مار سکتا۔ ایک ایسا زبردست گھونسا جس سے سارے کمروں کے کواڑ چرچرا جائیں اور سارے برآمدوں کی چقیں ہوا میں اُڑ جائیں اور شرابی قہقہوں کی دھجیاں فضا میں بکھر جائیں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا ہے؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا ہے؟ یہ جوان رات... لالہ میراں شاہ نے غصے میں اپنے دانت پیس لیے۔

رات آج جوان ہے اور بڑی عجیب ہے۔ گومتی نے سوچا یہ میرے دل میں کیسی ترنگیں سی اُٹھ رہی ہیں جیسے آج پہلی بار میرا بیاہ ہو رہا ہے۔ آج اس نے اپنا سب سے اچھا عنابی رنگ کا شنیل کا سوٹ پہنا اور ہاتھوں میں کامدار چوڑیاں پہنیں اور پیلے گلاب کا عطر لگایا۔ آج وہ خود بالکل نئی نئی سی محسوس کر رہی تھی۔ لالے کی پریشانی سے اسے بڑی مسرت ہوئی تھی اور گل کی چیخیں سُن کے اسے وہ دن یاد آ گیا تھا جب تحصیلدار صاحب پہلی بار اس کے گھر آئے تھے اور لالہ میراں شاہ ان دونوں کو ایک کمرے میں اکیلا چھوڑ کے رات کے دس بجے کسی ضروری کام کا بہانہ کر کے نیچے گاؤں میں چلا گیا تھا اور دو بجے واپس آیا تھا۔ آج گل کو بھی گھر جاتے ہوئے دو بجیں گے۔ ہائے یہ رات کتنی حسین ہے! آج وہ کس طرح حشمت اللہ بیگ کو تڑپائے گی، اس کی موٹی حرص کی ہڈیوں پر سے گوشت نوچ نوچ لے گی۔ لیکن اسے قریب نہیں پھٹکنے دے گی۔

گومتی سنج سجا کے ہاتھ میں کھانے کا تھال لے کے بانڈی کی طرف چلی۔ اللہ داد اور شوکت پہرے پہ تھے۔

گومتی نے اللہ داد سے کہا "چابی؟"

اللہ داد نے چابی دے دی

گومتی نے کہا: "لالہ پوچھے تو کہہ دینا میں تھانیدار صاحب کو کھانا کھلا رہی ہوں اور تھانیدار پوچھے تو کہہ دینا میں لالے کے پاس ہوں۔"

"لیکن۔" اللہ داد نے کہا۔

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ دونوں ایک دوسرے کو پوچھنے کی کبھی ہمت نہیں کریں گے۔ اس لیے کوئی ڈر نہیں مجھے۔ میں اس تمہارے ملزم کو کھانا کھلا کے آتی ہوں۔"

گومتی نے تالے کو چابی لگائی۔

دروازہ کھلا۔

اللہ داد کانپنے لگا۔

بانڈی کے اندر عبدل کو پھر وہی بے نام سی مہک آئی۔ ارے یہ تو پیلے گلاب کی مہک ہے، ہاتھ میں تھال لیے اور تھال کے اندر چراغ جلائے ہوئے یہ سونے کی مورت اس کی طرف بڑھتی آرہی ہے عبدل اُٹھ کر بیٹھ گیا، بیٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ کھڑا ہو کر اس مورت کی طرف چلنے لگا۔ اس نے تھال ہاتھ سے تھام کر نیچے اُتروا لیا اور

اس نیم اندھیرے اور نیم اُجالے میں اسے گومتی کے پراسرار ہونٹ اور اس کی سحر آمیز آنکھوں کی وحشی چمک اک عجیب سا پیغام دیتی ہوئی معلوم ہوئی۔ عبدل کا دل کانپنے لگا اور نوراں بہت دور تھی اور گومتی کے جسم کی پکار بہت نزدیک تھی اور خود اس کا دل زور زور سے دھک دھک کر رہا تھا۔ اسے اپنی اس جوانی سے بھی خوف آنے لگا جو جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھی زندہ تھی اور اسے موت سے کھیلنے پر مجبور کر رہی تھی۔

گومتی نے کہا: "کھانا کھالو۔"

عبدل نے کہا: "آؤ پہلے باتیں کرلیں۔"

وہ دونوں سرسراتے ہوئے خشک دھیال پر بیٹھ گئے۔ ایک دوسرے کے بالکل قریب۔

عبدل نے پوچھا: "مجھے راولپنڈی بھیجنے کی تم نے کیا ترکیب سوچی ہے؟"

گومتی سب کچھ بھول چکی تھی: راولپنڈی، ترکیب، عبدل، گرفتاری اسے صرف عبدل یاد تھا: دن کو، سہ پہر کو، شام کو۔ اب تک صرف عبدل یاد رہا تھا۔ اب یکایک جیسے عبدل نے اس کی یاد کو کھرچا تو راولپنڈی نکل آیا: تازہ، گرم، لہو کی طرح زندہ اور اس کے اندر سے سجن دیو، بن دیو ہنستا ہوا اس کے سامنے کھڑا تھا اور گومتی کے دونوں ہاتھ اس کے دونوں ہاتھوں میں تھے اور ایک ایسی

پاکیزہ مسکراہٹ جو گومتی نے اس کے بعد نہ کبھی اپنے چہرے پر، نہ کسی دوسرے چاہنے والے کے چہرے پر دیکھی تھی۔ گومتی یکایک ساری باتیں، سارے ڈھنگ، سارے عشوے بھول گئی۔ آج سے کئی برس پہلے کی الھڑ لڑکی بن گئی جو سچے دل سے محبت کرنا چاہتی تھی لیکن جسے میراں شاہ کی دولت اپنی طلائی زنجیروں میں باندھ کے کھینچ لائی۔ گومتی کا سینہ زور زور سے ہلنے لگا۔ عبدل کا چہرہ بھی تو ایسا تھا، سجن دیو کی طرح، سندر، پاکیزہ، بھولا اور اُلجھا ہوا جیسے وہ کچھ نہ سمجھ رہا ہو کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ اسے جسم کی پکار کو سننا ہے یا اسے اُوپر اُٹھا کر ایک نئی سطح پر لے جانا ہے۔ جوان، ناتجربہ کار، نابخت چہرہ، چہرہ جو رہنمائی اور مدد اور ڈھارس چاہتا ہے۔ اسے عبدل ایسا چہرہ کیوں نہیں ملا، اسے میراں شاہ کیوں ملا؟ کیوں؟ کیوں؟ اس نے دونوں ہاتھوں میں اپنا منہ چھپا لیا۔

عبدل نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

"مجھے مت چھوؤ۔" گومتی نے اسے دھکا دے کر کہا۔

عبدل حیران رہ گیا۔

گومتی نے عبدل کے شانے پر اپنا سر رکھ دیا۔ بولی: "مجھے معاف کر دو، میں اس وقت اپنے آپے میں نہیں ہوں۔ میں چاہوں تو تم کو تباہ کر سکتی ہوں مگر نہیں کروں گی۔ تمہیں زندہ رہنے کا

حق ہے۔"

"کیسی عجیب باتیں ہیں تمہاری شاہنی ؟"

"ہاں عجیب تو ہیں، عبدل جب تم بیاہ کرو گے تو میری باتیں یاد کرو گے، کسی نے تمہیں یوں مٹھی میں بند کر کے چھوڑ دیا تھا۔"

"عبدل نے کہا: "میں نوراں سے شادی کروں گا۔"

"نوراں کون ہے!" گومتی نے گھبرا کے کہا۔

عبدل کے دل میں نوراں اب یوں آئی جیسے دور سے گھنٹی کی صدا آئے اور ہر لحظہ قریب آتی جائے۔ نوراں، نوراں، نوراں، نوراں نوراں، نوراں... عبدل کا چہرہ مسرت سے کھلتا گیا۔ اس نے بڑے ہی پیارے من موہنے لہجے میں کہا۔

"نوراں میری ہونے والی بیوی ہے۔"

گومتی عبدل کے قریب سے اُٹھ بیٹھی۔ بولی: "تم کھانا کھالو تو پھر میں تمہیں آزاد کر دوں گی۔"

عبدل نے کہا: "آزادی کا خیال آتے ہی میری بھوک اُڑ گئی ہے۔"

"تو چلو اسی وقت باہر چلو۔"

عبدل اُٹھ کھڑا ہوا۔

گومتی نے کھانے کے تھال کی طرف دیکھا: کتنی محنت اور محبت سے اس نے کھانا تیار کیا تھا۔ کتنی محنت اور محبت سے وہ

آج سجی تھی۔ کتنی جوان راتوں کی اُمید بھری ترنگیں لیے آج وہ اس باندی میں آئی تھی۔ یکایک غصے میں آکے گومتی نے زور سے تھال کو ٹھوکر ماری اور تھال جھنجھناتا ہوا، چکراتا ہوا، فضا میں لڑھکتا ہوا دیوار سے جا لگا اور وہاں سے گر کر بھینس کے پاس جا گرا۔ بھینس تھال کو سونگھنے لگی جیسے لالہ میراں شاہ کھانا کھا رہا ہو۔

عبدل نے کہا — "کیا — کرتی ہو۔"

"کچھ نہیں!"

عبدل بولا: "باہر کے سپاہی مجھے کچھ نہیں کہیں گے۔"

"نہیں کچھ نہیں کہیں گے۔"

"میں کس طرح تمہارا شکریہ ادا کروں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

"میں راولپنڈی میں ضرور سجن دیو سے ملوں گا۔"

"تمہاری مرضی۔"

"اس سے مل کے کیا کہوں؟"

یکایک گومتی کو چکر آ گیا۔ وہ دیوار کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔ پھر بڑے ہی مایوس، نا اُمید، اُداس پھیکے لہجے میں کہنے لگی: "اس سے کہنا جس لڑکی سے تو محبت کرتا تھا وہ آج کل چکلے میں بیٹھی ہے۔"

"شاہنی کیا کہتی ہو؟"

"سچ کہتی ہوں عبدل۔" گومتی سسکنے لگی۔

پھر یکایک اس نے اپنا جی کڑا کر لیا۔ بولی: "اچھا اب یہ دروازہ کھول دو اور باہر چلے جاؤ۔"

"باہر سپاہی جو ہیں۔"

"تم دروازہ تو کھولو۔"

عبدل نے دروازہ کھولا۔ دروازہ زور سے چرچرایا۔ باہر کی روشنی اندر آئی، اندر کا اندھیرا باہر گیا۔ عبدل دروازے پر کھڑا رہا۔ شوکت اور اللہ داد اسے پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔

"کون ہے؟" شوکت نے للکارا۔

"میں عبدل ہوں۔"

شوکت نے چاقو نکالا، اللہ داد آگے بڑھ آیا۔

"کیا بات ہے شاہنی؟"

گومتی نے ہر قسم کے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔

"یہ بانڈی کا دروازہ ہے، اس دروازے سے ایک آدمی باہر جائے گا اور ایک آدمی اندر آئے گا۔"

ایک بھینی بھینی خاموشی کے بعد اللہ داد نے کانپتے ہوئے لہجے میں کہا: "اچھا!"

"نہیں نہیں۔" عبدل نے زیر لب کہا۔

"شوکت بولا: "کیا کر رہے ہو اللہ داد۔"

"نہیں نہیں مجھے منظور نہیں ہے۔" عبدل بولا۔

گومتی نے بڑی سختی سے کہا: "اب تم ایک لمحے کی دیر نہ کرو۔ پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے، اور ممکن ہے میں اپنا ارادہ بھی بدل دوں۔ اس ایک لمحے کی نیکی سے فائدہ اٹھا لو اور بھاگ جاؤ اور میں یہاں بانڈی کے اندر کھڑی ہوں اور تمہیں دیکھتی رہوں گی جب تک تم نظروں سے غائب نہ ہو جاؤ گے اس بانڈی کے اندر کوئی قدم نہیں رکھ سکے گا۔"

گومتی نے دھکا دے کر عبدل کو بانڈی سے باہر نکال دیا۔ عبدل دھیمے دھیمے قدموں سے چلتا رہا اور مڑ مڑ کر دیکھتا رہا۔ پھر وہ تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔ آخر میں وہ دوڑتا ہوا جنوبی ڈھلوان سے نیچے اُتر گیا۔ حدِ اُفق پر گومتی کو امید تھی وہ مڑ کر ضرور دیکھے گا مگر اس نے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ گومتی کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ آئی۔ اس نے آہستہ سے لرزتی ہوئی آواز میں اللہ داد سے کہا:

"اندر آجاؤ اللہ داد، مویشی خانے کا دروازہ تمہارے لیے کھلا ہے۔"

نیا خزانہ

میں اپنے بستر پر بڑے آرام سے لیٹا ہوا تھا اور نیم غنودگی کے عالم میں اپنی پرانی کہانی پڑھ رہا تھا جس میں لڑکی بہت خوبصورت تھی، محبت بڑی اُداس تھی اور انجام کچھ ایسا تھا اور کچھ ایسا نہیں بھی تھا۔ بڑی ہی نرم نرم، نیم گرم شہد سے بھری کہانی تھی جو شاید نیم بیداری کے عالم میں لکھی گئی تھی۔

اتنے میں میرا لڑکا: عمر چھ سال، قد چھوٹا، نیکر پھٹی ہوئی، آنکھیں چمکتی ہوئیں، اُچھل کر میرے بستر پر آگیا۔ اور بڑی بے قراری مگر چاؤ بھرے انداز میں مجھ سے پوچھنے لگا۔

"میرا خزانہ دیکھو گے؟"

"خزانہ"

"ہاں" اس نے کہا، "بالکل نیا خزانہ ہے، دیکھو گے؟"

میں نے کہا: "دکھاؤ، دیکھیں گے۔ لیکن تمہارا پہلا خزانہ کیا

ہوا؟"

لڑکے نے کہا: "وہ میں نے مالی کے لڑکے بجو کو دے دیا۔" اتنا کہہ کے لڑکے نے اپنی بند جھولی میرے سامنے کھول دی۔ سب سے پہلے اس نے ایک ماچس کی ڈبیہ نکالی۔ اس ڈبیہ کو اس نے یوں کھولا جیسے تماشا شروع ہونے سے پہلے اسٹیج سے پردہ ہٹایا جاتا ہے جب پردہ ہٹ گیا تو میں نے دیکھا کہ ماچس کی ڈبیہ کے اندر کانچ کی ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے چھوٹے بڑے ٹکڑے اکٹھے کیے ہوئے تھے۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

لڑکے نے میری طرف دیکھا گویا اسے میری بے وقوفی پر افسوس ہو رہا ہو۔ مگر اس کی نگاہ میں تیکھا پن تھا۔ میرا لڑکا مجھے شفقت سے سمجھاتے ہوئے بولا: دیکھو یہ موتی ہیں۔"

"موتی ہیں؟"

"ہاں، ممی کی چوڑیوں سے بنائے ہیں۔"

اس کے بعد اس نے خزانے کی ڈبیہ کو بند کر دیا اور ایک دوسری ڈبیہ نکالی۔ اس ڈبیہ میں بہت سے پرانے نب بھرے ہوئے تھے۔ ریڈ انک نب جن سے میں اکثر اپنی کہانیاں لکھتا ہوں اور اکثر ایک کہانی لکھتے وقت تین چار نب استعمال کرتا ہوں اور پھینک دیتا ہوں۔ اصل میں مجھے ریڈ انک نب کی تیز دھار بے حد پسند ہے۔ لکھتے وقت ایسا لگتا ہے۔ گویا نب کہانی کے سینے میں اُترا جا رہا ہے۔

ہل کی پھالی کی طرح کسی انجان ان دیکھی دھرتی کو چیرتا ہوا آگے بڑھتا جا رہا ہے۔ کسان کی فصل کی طرح کہانی بھی دھیرے دھیرے پکتی ہے: پہلے اس میں کونپلیں پھوٹتی ہیں، پھر پودا اونچا ہوتا ہے پھر اسے ہوا اور روشنی ملتی ہے۔ پھر آسمان کی طرف دیکھتی ہوئی نوکیلے پتوں پہ بالیاں سرسراتی ہیں، تب جا کے کہیں محبت کا ایک دانہ پیدا ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی محبت کا ایک دانہ بھی پیدا نہیں ہوتا اور ساری دھرتی بنجر رہ جاتی ہے۔ اس بنجر کہانی کے گھاؤ کو ایک افسانہ نگار سے زیادہ اور کوئی نہیں جان سکتا۔

لڑکے کی ڈبیہ انہیں پرانے بنوں سے بھری ہوئی تھی جن سے میں نے نئی اور پرانی کہانیاں لکھ دی تھیں۔ اچھی اور بری کہانیاں۔ جو ازل کی طرح پرانی تھیں اور آج کے انسان کی مانند نئی تھیں۔ محبت میں ڈوبی ہوئی کہانیاں، غیض و غضب سے بھرپور کہانیاں رنگین بجلی کی مانند چمکتی ہوئی کہانیاں اور بے رنگ پھیکی سیٹھی کہانیاں جیسے بیج اندر سے سڑ جائے اور کہانی کی کوکھ بانجھ ہو جائے لیکن یہ سب اپنی محنت کی کہانیاں تھیں۔ ان میں میرے خیالات کا درد اور میرے احساس کا پسینہ شامل تھا۔ اس لیے میں نے اپنے لڑکے کے خزانے کے قصے کو بڑی دلچسپی سے دیکھا اور اس سے پوچھا۔

"یہ سب کیا ہے؟"

لڑکے کو اب میری حماقت کا پورا یقین ہو چکا تھا۔ اس لئے

مسکرا کر بولا: "ارے بھئی یہ نب ہیں۔"

میں نے پوچھا: "ان سے تم کیا کرتے ہو۔"

وہ بولا: "کچھ نہیں کرتا۔ میں ان سے کھیلتا ہوں۔"

"کیسے؟"

وہ بولا: "دیکھو یہ نب ہیں اور یہ ان کا باپ ہے۔"

یہ کہہ کر لڑکے نے ماچس کی تیسری ڈبیہ کھولی اور اس میں سے ایک مقناطیس نکالا۔ مقناطیس نے ایک نب کو اپنے پاس بلا لیا جب ایک نب آیا تو پھر آہستہ سے باقی نب بھی ایک دوسرے کی اُنگلی پکڑے مقناطیس سے لگ کر لپٹ گئے۔

بچے نے ہنس کر دیکھا؟ یہ ان کا باپ ہے، یہ نب اس کے بچے ہیں۔ ایک دوسرے کی اُنگلی پکڑے قطار میں کھڑے ہیں، سمجھے؟"

یکایک میں سمجھ گیا۔ اتنی کہانیاں لکھنے کے باوجود جو کچھ نہ سمجھ سکا تھا اسے اب سمجھ گیا۔ یوں تو میں جانتا تھا کہ کہانیاں اچھی ہوتی ہیں اور بری ہوتی ہیں۔ وہ لمبی ہوتی ہیں اور چھوٹی ہوتی ہیں، وہ قسم قسم کی ہوتی ہیں لیکن اب تک یہ نہیں جانتا تھا کہ سب کہانیوں کا ایک ہی مقناطیس ہوتا ہے جس کے سہارے وہ خلا میں کھڑی ہو جاتی ہیں اور وہ مقناطیس ہے۔ انسان! انسان کے بغیر کوئی کہانی کھڑی نہیں ہو سکتی۔

مجھے اب بچے کے خزانے میں بہت دلچسپی معلوم ہونے لگی تھی۔

اس لیے میں نے اس سے کہا: "آگے دکھاؤ اور کیا ہے تمہارے پاس؟"

اب لڑکے نے تصویروں کا ایک بنڈل میرے سامنے رکھ دیا۔ پہلی تصویر کسی مہاراجے کی تھی جس کے گلے میں ہیرے جواہرات کے ہار پڑے ہوئے تھے۔ میں نے لڑکے سے پوچھا:

"یہ بھلا مانس کون ہے؟"

لڑکے نے کہا: "یہ گوتم بدھ ہے۔"

لڑکے نے شاید اپنی بہن سے کل ہی گوتم بدھ کا نام سنا تھا۔ یہ نام اسے بڑا ہی عجیب اور نیا لگا۔ اس نے جھٹ اس نام کو اس تصویر کے ساتھ چپکا دیا اور میں سوچتا ہوں کیا برا کیا۔ اس ملک میں بچے کیا بڑے لوگ بھی آج تک مہاراجوں کو گوتم بدھ کی طرح "پاک، صاف، نیک... دیوتا کے مانند مقدس" سمجھتے ہیں۔ مجھے کیا پڑی ہے کہ ایک بچے کی غلط فہمی دور کروں، بڑا ہو کر خود ہی سمجھ جائے گا۔

بچے نے ایک اور تصویر نکالی۔ اس تصویر میں ایک خوبصورت مراٹھی لڑکی ایک پوسٹ آفس میں خط ڈال رہی تھی۔ میں نے پوچھا "یہ کیا ہے؟"

لڑکے نے کہا: "یہ عورت لیٹر بکس میں خط ڈال رہی ہے اور اس کا گھر لیٹر بکس کے بہت قریب ہے؟"

"میں نے کہا: "تمہیں کیسے معلوم اس عورت کا گھر لیٹر بکس کے بہت قریب ہے؟"

لڑکے نے میری طرف پھر پہ رحم نگاہوں سے دیکھا: "دیکھتے نہیں ہو، اس کے پاؤں ننگے ہیں۔ جبھی تو بس گھر سے نکل کر جلدی سے خط ڈالنے چلی آئی ہے۔ دور جانا ہوتا تو چپل پہن کے نہ جاتی؟"

میں نے اپنی خفت چھپانے کے لیے کہا: "ٹھیک ہے، اب اگلی تصویر نکالو؟"

ننھے شرلاک ہومز نے ایک اور تصویر میرے سامنے رکھ دی۔ اس تصویر میں ایک پنجرا تھا۔ پنجرے میں طوطا تھا۔ طوطے کے پاس ایک خوبصورت عورت بھڑکیلے کپڑے پہنے اپنے زیورات کا ڈبہ کھولے بیٹھی تھی اور طوطے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے پوچھا "یہ عورت اس طوطے کی طرف کیوں دیکھ رہی ہے؟"

بچے نے کہا: "یہ عورت اس طوطے سے پوچھتی ہے بتا میرا موتی کہاں ہے؟"

"کہاں ہے اس کا موتی؟"

بچے نے غور سے اس تصویر کو دیکھا۔ موتی پنجرے میں نہیں تھا طوطے نے کوٹ نہیں پہنا ہوا تھا ورنہ موتی اس کی جیب میں ہوتا۔ آخر سوچ سمجھ کر بچے نے کہا: "موتی طوطے کی آنکھ میں ہے۔ طوطے نے موتی کو اپنی آنکھ میں چھپا لیا ہے۔"

اب تک میں نے ایسی بہت سی کہانیاں لکھی تھیں جس میں انسان نے اپنی آنکھ میں آنسو کو چھپا لیا تھا لیکن اس طوطے کی کہانی اب تک میں نے نہیں لکھی جس نے ایک موتی کو اپنی آنکھ میں چھپا لیا تھا جانے کب یہ کہانی لکھی جائے؟ جانے اور کون اسے لکھے گا؟ لیکن یہ کہانی ایسی ہے کہ ہزاروں سال گزر جانے کے بعد بھی پرانی نہ ہوگی بلکہ طوطے کی آنکھ کی طرح چمکتی رہے گی۔

بچہ اگلی تصویر دکھانے والا تھا کہ اتنے میں اس کی ماں نے آکر کہا، "ننھے اُٹھو! نو بجنے والے ہیں، تمہیں اسکول جانا ہے!"

ننھے کو جھٹکا سا لگا۔ مجھے بھی لگا۔ ہم ایسی خوبصورت دنیا میں تھے جہاں اسکول کا نام لینا بھی گناہ تھا اور اسکول بھی کیسا اسکول تنگ کمرے، اندھیرے دالان، غریبی کی تلخ یادوں کا مارا ہوا مفلس ماسٹر اور اس کی نفرت اور غصے سے بھرپور چھڑی ——

یہ نفرت جو کہیں دور سے آتی تھی، لیکن اُترتی ہمیشہ بچوں پر تھی۔

ننھا سہم گیا۔

میں بھی سہم گیا۔

لیکن کیا کیا جائے، مجبوری تھی، اسکول جانا ضروری تھا۔ بچے نے میری طرف دیکھ کر بڑی بے بسی سے کہا:

"اسکول —— اسکول نہ جاؤں تو کیا ہوگا؟"

ماں نے کہا: "تم اسکول کیوں نہ جاؤ گے؟ آج تو چھٹی

نہیں ہے۔" بچے نے پوچھا: "آج کیوں چھٹی نہیں ہے۔ کل بھی چھٹی تھی، پرسوں بھی تھی۔ آج کیوں نہیں ہے؟"

میں نے کہا: "روز روز چھٹی نہیں ہوتی۔"

وہ بولا: "کیوں نہیں ہوتی؟"

ماں نے اسے میری گود سے اُٹھا کر زمین پر کھڑا کر دیا:

"ہوں... اب سیدھے اسکول چلے جاؤ... بہانے نہ بناؤ۔"

لڑکے نے اپنے سامنے دو بے رحم انسانوں کو دیکھا۔ ہمارے چہروں پر اسے کہیں وہ رنگین تتلی نہ دکھائی دی۔ نہ وہ لمبے کانوں والا خرگوش نہ ننگے پاؤں گھومنے والی مراٹھی لڑکی — اس نے بڑی اُداسی سے ہمارے دو چہروں کی بے رحمی کو پڑھ لیا اور مایوس ہو کر اپنا بستا باندھنے لگا۔ اور اس بستے میں ایسی ہی کتابیں تھیں جو ہمارے چہروں کی طرح سخت اور بے رحم تھیں۔ بچہ بہت کچھ چاہتا ہے، وہ بہت کچھ کہہ سکتا ہے۔ لیکن اسے بہت کچھ نہیں ملتا کیونکہ وہ بچوں کی دنیا نہیں ہے۔ یہ بوڑھوں کی دنیا ہے اور بے ایمان، بدکار اور بدمعاش لوگوں کی دنیا ہے جس کے منہ میں دانت ہے نہ پیٹ میں آنت۔ وہ بچہ اپنی تصویروں میں اس دنیا کو ڈھونڈتا ہے جو بچوں کی طرح مسکرا سکے۔ اس لیے بچے نے چپ چاپ بستہ باندھ لیا، بغل میں دبا لیا، اپنے خزانے کو اپنی جیبوں میں ٹھونس لیا اور ہماری طرف دیکھے بغیر پڑھنے کے لیے چلا گیا۔

بچے کا اسکول گھر کے بہت قریب تھا۔ گھر سے اسکول تک آدھا فرلانگ سے بھی کم سڑک ہوگی جس کے ایک طرف امیر آدمی کے بنگلے کی لمبی دیوار چلی جاتی تھی اور دوسری طرف گل مہر کے پیڑوں کی قطار تھی۔ ان دونوں کے بیچ کی سڑک پر میں الٹا کاچپ چاپ سر جھکائے ہوئے اسکول جا رہا تھا کہ میں نے ایک پیڑ کے پیچھے سے نکل کر اس کا راستہ روک لیا۔

لڑکے نے میری طرف دیکھا۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس سے دھیرے سے کہا: "آؤ اسکول سے بھاگ چلیں۔"

اسکول سے بھاگنے کی بات ابھی تک بچے کے دماغ میں نہ آئی تھی۔ یکایک اس کا چہرہ اس خیال کی روشنی سے بھر گیا۔ یہ روشنی اس کی آنکھوں میں چمکنے لگی۔ اس کے اُداس رخسار پھول کی طرح کھل گئے۔ میں اس کے چہرے کا بدلا ہوا رنگ دیکھ رہا تھا۔ اس کی حیرت اور پھر امید اور خوشی سے بھرپور راگ کو سن رہا تھا بچے کا خاموش چہرہ بھی خوشی کے کیسے کیسے گیت گاتا ہے۔

اس نے اُچھل کر میری اُنگلی پکڑ لی۔ پھر چلتے چلتے یکایک رک گیا۔ میری طرف سنجیدگی سے دیکھ کر بولا: "ماں سے نہیں کہو گے؟"

میں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہا: "ششش...."

ڈھاک کے ایک پیڑ کے آگے جہاں بہت سے بیریوں کے

جھنڈ تھے وہاں ہم نے بستے کو اچھے طرح چھپا دیا اور پھر ہم گھوم کر ایک تنگ سی پگڈنڈی پر ہو لیے جو جنگل سے دور ناریل کے ایک جنگل میں سے گزرتی تھی۔

اس دن ہم بہت گھومے۔ وہ صبح بھی بہت صاف اور چمکیلی تھی۔ جنگل میں چاروں طرف سناٹا تھا۔ ایک طرف ہلکی ہلکی ہرے رنگ کی ٹھنڈی روشنی چاروں طرف چھائی ہوئی تھی۔ ہم دونوں ننگے پاؤں دھرتی پر چل رہے تھے۔ کیونکہ میں بھی مراٹھی لڑکی کی طرح جلدی سے ننگے پاؤں ہی گھر سے بھاگ آیا تھا۔ بہت دنوں بعد آج میرے ننگے پاؤں دھرتی پر چل رہے تھے اور بچپن کے پرانے جانے پہچانے کنکر میرے پاؤں سے گلے مل رہے تھے۔ میرے پاؤں میں ایک عجیب خوشی کا احساس رچتا گیا اور میں اپنے بچے کو ساتھ لیے جنگل میں دوڑتا گیا۔

بچے کو جنگل کی مسرت بخش روشنی بے حد پسند آئی، بولا:

"یہاں دن ہے؟"

میں نے کہا: "ہاں دن ہے۔"

"ہمارے گھر میں بھی دن ہے؟"

میں نے کہا: "ہمارے گھر میں بھی دن ہے۔ اس وقت سب گھروں میں دن ہے۔"

اس نے پوچھا: "دن میں رات نہیں ہوتی؟"

میں نے کہا: "پگلے دن میں رات نہیں ہوتی۔"
لڑکے نے ضد سے پوچھا: "تھوڑی سی بھی نہیں ہوتی؟"
میں نے پریشان ہو کر کہا: "کیا فضول سوال کر رہے ہو۔ بھلا دن میں رات کیسے ہو سکتی ہے۔"
لڑکے نے کہا: "اس وقت دن ہے تو ہمارے مالی کے گھر میں رات کیوں ہے؟"

میرے جسم میں ایک عجیب سی سنسنی دوڑ گئی اور مجھے اپنے بنگلے کے باہر مالی کا جھونپڑا یاد آیا جہاں دن کو بھی رات ہوتی ہے اور دوپہر میں بھی اندھیرا چھایا رہتا ہے اور مجھے مالی کا گھر اور بہت سے دوسرے گھر یاد آئے جہاں دن میں بھی اندھیرا رہتا ہے اور پھر مجھے فلک بوس عمارتیں یاد آئیں جہاں رات کو بھی دن ہوتا ہے۔ ایسے گھر جہاں تھوڑا سا دن اور لمبی سی رات ہوتی ہے۔ ایسے گھر جہاں تھوڑی سی رات ہوتی ہے اور لمبا سا دن ہوتا ہے۔ شاید یہ بچہ سماجی تجزیہ نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر بچہ ارسطو اور افلاطون نہیں ہوتا تو وہ ان فلسفیوں کی طرح بھی نہیں ہوتا جو دن میں رات اور رات میں دن کی عجیب و غریب تاویلیں پیش کر سکتے ہیں۔ لیکن ایک بچے کو کسی طرح مطمئن نہیں کر سکتے جو دن میں رات اور رات میں دن کو دیکھتا ہے اور اس تضاد پر متعجب سے چپ رہ جاتا ہے۔

میں بچے کے سوال کا جواب نہ دے سکا کیونکہ میرا جواب بہت لمبا تھا اور میرا بچہ بہت چھوٹا تھا اور سامنے اب چھوٹی سی ایک ندی آگئی تھی اس لیے میں نے بچے کو اپنی گود میں اٹھا لیا اور اسے ندی کے پار ایک اونچے ٹیلے پر لے گیا جہاں ایک چرواہا بہت سی گائے بھینسوں کو چرا رہا تھا۔ بچے نے ایک دو گائے بھینسیں تو ضرور دیکھی تھیں۔ مگر اتنی ساری گائے بھینسیں آج پہلی بار دیکھی تھیں۔ اس لیے پہلے تو وہ بڑی حیرت سے ان کو تاکتا رہا۔ پھر بولا: "یہ سب گائے بھینسیں ہیں؟"

"ہاں۔"

"اور وہ کیا ہیں؟"

"وہ بکریاں ہیں۔"

"بکریاں؟"

"ہاں۔"

"اور وہ کیا ہیں؟"

"وہ بھیڑیں ہیں۔"

"بھیڑیں؟"

"ہاں۔"

میں نے بچے کا تعارف دو تین ننھے منے بکری اور بھیڑ کے بچوں سے کرا دیا۔ بچہ ان سے کھیلتا رہا۔ پھر اس نے ایک بچھڑے

کو گائے کے تھن سے دودھ پیتے دیکھا۔ بچہ سمجھ گیا۔ بولا: "یہ ماں کا دودھ پیتا ہے۔"

میں نے کہا: "ہاں۔"

بچے نے پوچھا اور جو ہمارے گھر دودھ آتا ہے، وہ کہاں سے آتا ہے؟"

"انہیں گائے بھینسوں کا دودھ ہوتا ہے۔

اس دودھ کو یہ لوگ بچھڑے کے منہ سے نکال لیتے ہیں؟"

میں نے کہا: "نہیں منہ سے نہیں نکال لیتے، دودھ دوہ لیتے ہیں۔"

"کیسے دوہ لیتے ہیں؟"

میں نے چرواہے کو چونی دی اور اس نے ایک گائے کو دوہ کر دکھا دیا۔ نہ صرف دودھ دوہ کے دکھایا بلکہ اس نے بچے کو اپنی گود میں اس طرح بٹھا لیا جس طرح وہ گائے دوہتے وقت مٹکی کو اپنے گھٹنوں میں رکھتا تھا۔ پھر اس نے گائے کے تھن کی دھاریں بچے کے منہ میں ڈالیں۔ بچے کو بہت لطف آیا اور جب دودھ کی دھار غلطی سے بچے کے چہرے پر بکھر گئی تو وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ اس نے مجھ سے دھیرے سے کہا: "بڑا ہو کر میں بھی اسی طرح چرواہا بنوں گا۔" تھوڑی دیر کے بعد ہم چرواہے کو بہت پیچھے چھوڑ آئے۔ اب ہم وہاں پہنچ گئے جہاں سے سمندر نزدیک

تھا اور ایک چھوٹا لڑکا جو میرے لڑکے سے پانچ چھ سال بڑا ہوگا بڑے اطمینان سے کیچڑ اور پانی میں کھڑا ہو کر کیکڑے پکڑ رہا تھا بچے کو کیکڑے پکڑنے والے بچے کی بہادری بہت پسند آئی۔ کتنے اطمینان سے وہ کیکڑے کو اپنے ہاتھ سے اٹھا لیتا تھا۔ اس کے سامنے کے دو بازو الگ کر کے انہیں توڑ توڑ کر وہاں دھاگے باندھ کر اپنی جھال والی بھوری پیٹی میں ڈال دیتا تھا۔ میرا لڑکا بڑے انہماک سے اس کام کو دیکھتا رہا اور جب وہاں سے چلے اور بہت دور آگے نکل گئے تو لڑکے نے ٹھنڈی سانس بھر کر مجھ سے کہا: "میں بھی بڑا ہو کر کیکڑے پکڑا کروں گا۔"

جنگل میں گھومتے ہوئے نئے نئے پیڑوں، پھولوں اور تتلیوں سے متعارف ہوتے ہوئے ہم لوگ ایک پرانے مندر کی سیڑھیوں پر جا بیٹھے۔ یہ بہت پرانا مندر تھا اور اس کی چھت ٹوٹی ہوئی تھی اور وہاں سے آسمان نظر آ رہا تھا۔ سیڑھیاں چڑھنے کے بعد ہمیں پتھر کا ایک بہت بڑا بیل دکھائی پڑا جو مندر کے باہر بیٹھا تھا۔

لڑکے نے کہا: "یہ بیل ہے نا؟"

"ہاں۔"

"یہاں کیا کر رہا ہے؟"

میں نے کہا: "مندر کے سامنے آرام کر رہا ہے۔"

"یہ مندر ہے؟"

"ہاں۔"

"مندر کیا ہوتا ہے؟"

"مندر میں پوجا ہوتی ہے۔"

"پوجا کیا ہوتی ہے؟"

میں چپ ہو گیا۔ اسے کیا بتاتا کہ پوجا کسے کہتے ہیں کیونکہ بھگوان اور خدا کا خیال تو بہت بعد کی چیز ہے۔ پہلے تو بچہ دودھ پیتا ہے ماں کا چہرہ دیکھتا ہے، گھٹنوں کے بل چلتا ہے اور پھر بولنا شروع کرتا ہے۔ پہلا لفظ جو ہو سکتا ہے وہ آپا اور ماں اور پانی اور روٹی کے کھلونے کے نام ہوتے ہیں اور بھائی بہنوں کے پیار ہوتے ہیں۔ اس ننھی چھوٹی سی پیاری دنیا میں پوجا اور بھگوان کا خیال نہیں کھٹکتا۔ اس لیے میں نے بچے سے کہا۔

"مجھے بھی معلوم نہیں۔ لیکن آؤ اندر چل کر دیکھیں پوجا مندر میں کیسے ہوتی ہے؟"

ہم مندر کے اندر چلے گئے۔

مندر کی ٹوٹی پھوٹی عمارت کے اندر بہت سی مورتیاں ٹوٹی پڑی تھیں۔ بندروں کی مورتیاں اور ہاتھی گھوڑوں کی مورتیاں یہ مورتیاں بے حد خراب حالت میں دیواروں کے آس پاس پڑی تھیں اور اب ان پر جھاڑیاں بھی اُگ آئی تھیں۔ مندر کے وسط میں جہاں بڑی مورتی کو ہونا چاہیے تھا وہاں صرف پتھر کا ایک کنول

پھول باقی رہ گیا تھا جس کے گھیرے میں چڑیوں نے ایک گھونسلا بنا رکھا تھا۔ اس گھونسلے کے اندر تین بڑے ہی خوبصورت انڈے رکھے ہوئے تھے۔ نازک نازک نیلے رنگ کے تین انڈے جن پر جامنی رنگ کے دھبے بہت ہی خوبصورت معلوم ہوتے تھے۔

بچے نے خوشی سے چلا کر ایک انڈے کو ہاتھ میں اُٹھا لیا۔ بچہ بے حد خوش تھا۔ وہ خوشی سے چلا کر ایک انڈے کو ہاتھ میں اٹھا لیا۔ بچہ بے حد خوش تھا وہ خوشی سے اُچھل رہا تھا اور انڈے سے پیار کر رہا تھا۔ وہ کبھی اسے چومتا، کبھی گال سے لگاتا اور کبھی خوش ہو کر میری طرف دیکھتا۔ گویا اسے دنیا کا سب سے بڑا خزانہ مل گیا ہو۔ اس کی خوشی مجھ تک پہنچی اور میرا دل بھی ایک عجیب مسرت وانبساط سے بھر گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد بچے نے اس انڈے کو اُٹھا کر اپنی نیکر کی جیب میں ڈال لیا۔ اب دوسرا انڈا اُٹھانے لگا کہ میں نے روک دیا۔

"کیوں؟" لڑکے نے پوچھا۔

"یہ انڈے ہمارے نہیں ہیں، یہ انڈے اس مندر کے ہیں۔"

لڑکے نے دریافت کیا: "یہ پوجا کے انڈے ہیں؟"

"ہاں۔" میں نے خوش ہو کر کہا، "یہ پوجا کے انڈے ہیں۔"

"ان انڈوں کو گھونسلوں میں رکھ دو۔ پھر ایک چڑیا یہاں گاتی ہوئی آئے گی اور ان انڈوں کو اپنے پروں میں سمیٹ لے گی اور

پھر وہ گیت گائے گی اور گیت گائے گی ... اور گیت گائے گی اور مندر کی ٹوٹی ہوئی چھت سے آسمان مسکرائے گا۔ پھر اس کے پروں کا دامن پیار کی سنہری خوشی سے بھر جائے گا۔"

بچے نے خوش ہو کر کہا: "تب پھر پوجا پوری ہو جائے گی؟"

"ہاں پوجا پوری ہو جائے گی۔"

بچے نے خوش ہو کر انڈوں کو واپس گھونسلے میں رکھ دیا۔ اسے یہ پوجا بہت پسند آئی تھی۔ مجھے بھی اصل میں آج ہی معلوم ہوا کہ پوجا صرف بھگوان کو نہیں کہتے، پوجا ماں کو کہتے ہیں اور تخلیق کے عمل کو کہتے ہیں اور زندگی کے پیار کو کہتے ہیں۔

بچہ چلتے چلتے تھک گیا اور پھر میں نے اسے اپنی بانہوں میں اٹھا لیا اور چلتے چلتے اسے پریوں کے دیس کی ایک خوبصورت سی خواب کے مانند دھندلی دھندلی کہانی سنانے لگا جسے سنتے سنتے بچہ میرے شانے سے لگ کر سو گیا۔

پھر واپس آ کر میں نے بیری کے جھنڈ سے اس کا بستہ اٹھا لیا اور بازوؤں کو نیچے کر کے میں نے اپنے سوئے ہوئے بچے کا پرامید چہرہ دیکھا اور اس کے بھولے چہرے میں مجھے اپنے بچپن کا عکس نظر آیا اور وہ دن یاد آیا جب میں اس طرح ایک اندھیرے سے اسکول اور ایک ظالم استاد کے ڈر سے اسکول سے بھاگا تھا اور پھر مجھے اپنی زندگی کی بہت سی تلخ باتیں یاد آئیں اور پھر مجھے اردگرد کی زندگیوں کی لاکھوں چھوٹی

چھوٹی تلخیاں یاد آئیں جن کے گنجان پر خار راستوں سے گزر کر لاکھوں بچوں کے پاؤں چھلنی ہو چکے تھے۔ وہ دن جو راتوں کی طرح کالے تھے۔ وہ موتی جسے لالچی طوطوں نے اپنی آنکھوں میں چھپا لیا تھا وہ تصویر جنہیں کوڑھ کے مارے ہاتھوں نے دھبے دار بنا دیا تھا۔ کتنی ہی لمبی تلخ کہانیاں تھیں جو بچپن کے چہروں پر لکیروں اور جھریوں کا ایک لمبا جال پھیلاتی چلی گئی تھیں۔

کہتے ہیں کہ پریوں کے دیس میں ہر ایک کی خواہش پوری کی جا سکتی ہے۔ اگر یہ حقیقت ہے تو میں اس پریوں کے دیس کے بچے کو اپنی گود میں اٹھا کر اپنی خواہش کا اظہار کرتا ہوں اور چاہتا ہوں اس بچے کی کہانی ہماری نسل کی کہانی سے مختلف ہو، اچھی ہو۔ اس کی کہانی ایک ایسے زمانے کی کہانی ہو جس میں یہ بچہ اپنا چہرہ دیکھ سکے اور بچوں کی طرح مسکرا سکے۔

اس کے بعد میں اپنے خوابیدہ بچے کو چوم لیتا ہوں اور اسے کندھے سے لگا کر گھر کی جانب چل دیتا ہوں۔

آج آسمان بہت نیلا ہے اور میرے سر کے اوپر گل مہر کے پھول ہیں۔